علوم قرآن

مؤلف: استاد محمد ہادی معرفت

ادارۃ التنزیل

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرستِ مطالب

حرف ناشر	۶
مقدمہ مترجم	۱۰
پہلا سبق: علوم قرآن کا اجمالی تعارف	۱۱
قرآنی علوم کا تاریخی جائزہ	۱۲
قرآنی علوم پر اہم تصانیف	۱۳
سوالات	۱۴
دوسرا سبق: وحی کی حقیقت	۱۵
وحی کے لغوی معنیٰ	۱۵
قرآن مجید میں وحی کا استعمال	۱۵
وحی اور الہام میں فرق	۱۷
وحی رسالی کی اقسام	۱۸
نزولِ وحی کی کیفیت	۱۹
سوالات	۲۰
تیسرا سبق: نزولِ قرآن	۲۱
نزولِ قرآن کا آغاز	۲۲
نزولِ قرآن میں تین سال کی تاخیر	۲۲
نزولِ قرآن کی مدت	۲۳
سوالات	۲۶
چوتھا سبق: اسبابِ نزول	۲۷
سببِ نزول یا شانِ نزول	۲۸
تنزیل اور تاویل	۲۸
اسبابِ نزول تک رسائی	۲۹
سوالات	۳۱
پانچواں سبق: کاتبینِ وحی	۳۲
اُمّی کے معنیٰ	۳۲
سوالات	۳۵
چھٹا سبق: مکی اور مدنی سورتیں	۳۶
مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کا معیار	۳۸
مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کے طریقے	۳۹
ترتیبِ نزول	۴۰
سوالات	۴۳
ساتواں سبق: قرآن کریم کے اسماء اور اوصاف	۴۴
سورتوں کے نام	۴۷
بعض سورتوں کے متعدد نام	۴۹
قرآنی سورتوں کے گروہی نام	۵۰
قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی تعداد	۵۰
سوالات	۵۱
آٹھواں سبق: قرآن کریم کی جمع آوری اور تدوین	۵۲
مصحفِ حضرت علیؑ کی خصوصیات	۵۳
مصحفِ حضرت علیؑ کا انجام	۵۴
زید بن ثابت کا قرآن جمع کرنا	۵۵
جمع قرآن میں زید کا اسلوب	۵۶

صحابہ کرامؓ کے مصاحف	۵۷	قرائتِ قرآن کے متعلق اہل بیتؑ کے فرامین	۸۱
سوالات	۵۸	رائج قرآن سے شیعوں کا تعلق	۸۲
نواں سبق: اختلاف مصاحف	۵۹	**سوالات**	۸۴
اختلاف مصاحف	۵۹	تیرہواں سبق: قرآن مجید میں نسخ کا وجود	۸۵
حذیفہ کا مدینہ پہنچنا	۶۱	نسخ کی حکمت	۸۵
سوالات	۶۲	نسخ کی تعریف	۸۵
دسواں سبق: اتحاد مصاحف	۶۳	نسخ کی شرائط	۸۶
اتحاد مصاحف کمیٹی	۶۳	نسخ کی اہمیت	۸۶
اتحاد مصاحف کے مراحل	۶۴	نسخ کی حقیقت	۸۷
مصاحف عثمانی کی تعداد	۶۵	قرآن مجید میں نسخ کی ممکنہ اقسام	۸۷
مصاحف عثمانی کی خصوصیات	۶۶	منسوخہ آیتوں کی تعداد	۸۸
مصاحف عثمانی کا انجام	۶۷	**سوالات**	۹۰
رائج قرآن کی حفاظت سے متعلق آئمہ علیہم السلام کا مؤقف	۶۸	چودہواں سبق: محکم اور متشابہ	۹۱
سوالات	۶۹	قرآن کریم میں متشابہات	۹۱
گیارہواں سبق: قرائت اور قاریان قرآن	۷۰	قرآن کریم میں تشابہ کی قسمیں	۹۲
قرائت کی تعریف	۷۱	تفسیر میں تشابہ	۹۳
قرائتوں میں اختلاف کے اسباب	۷۱	تشابہ کے اسباب	۹۴
مشہور قرائتوں کی تدوین	۷۳	تفسیر اور تاویل	۹۴
سات قرائتوں کا انتخاب	۷۴	متشابہات کی تاویل کا علم کسے ہے؟	۹۵
قراء سبعہ اور ان کے راوی	۷۵	متشابہ آیات کے نمونے	۹۶
سوالات	۷۶	**سوالات**	۹۸
بارہواں سبق: قرائتِ حفص	۷۷	پندرہواں سبق: حروفِ مقطعات	۹۹
قرائت کے قابل قبول ہونے کا معیار	۷۷	حروفِ مقطعات کے متعلق مختلف نظریات	۹۹
قرائتِ حفص کی خصوصیات	۷۸	**سوالات**	۱۰۲
قرائاتِ سبع کی حجیت	۸۰	سولہواں سبق: قرآنی قصّے	۱۰۳

قرآنی قصوں کی خصوصیات ۱۰۳
قرآنی قصوں کے اہداف ۱۰۵
قرآنی قصوں کے تکرار کا راز ۱۰۸
سوالات ۱۰۹
ستر ہواں سبق: قرآنی قسمیں ۱۱۰
قسم کے ارکان ۱۱۰
قرآنی قسموں کی تقسیم ۱۱۱
قرآن کریم میں قسم کے موارد ۱۱۴
سوالات ۱۱۶
اٹھارہواں سبق: قرآنی مثالیں ۱۱۷
تمثیل کی خصوصیات ۱۱۷
قرآن کریم میں تمثیل کی اقسام ۱۱۸
قرآن کریم میں ضرب المثل کا استعمال ۱۲۲
سوالات ۱۲۴
انیسواں سبق: اعجازِ قرآن ۱۲۵
اعجاز کی ضرورت ۱۲۵
معجزۂ جاوید ۱۲۶
تحدّی قرآن ۱۲۷
تحدّی کے مراحل ۱۲۸
سوالات ۱۳۰
بیسواں سبق: اعجازِ قرآن کے مختلف پہلو (۱) ۱۳۱
۱ ۔اعجازِ بیانی ۱۳۱
الف ۔کلمات کا انتخاب ۱۳۱
ب ۔بہترین انداز بیان ۱۳۳
ج ۔قرآن مجید کا موزوں کلام ۱۳۳
د ۔وحدت موضوعی (آیات کے درمیان معنوی تناسب) ۱۳۴
ھ ۔ظریف نکات ۱۳۵
سوالات ۱۳۵
اکیسواں سبق: اعجازِ قرآن کے مختلف پہلو (۲) ۱۳۶
۲ ۔اعجازِ علمی (سائنسی اعجاز) ۱۳۶
الف ۔زیادہ بلندی پر سانس کی تنگی ۱۳۷
ب ۔ہوائی پردوں کے ذریعہ زمین کی حفاظت ۱۳۸
۳ ۔اعجاز تشریعی ۱۳۹
خدا کی صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ ۱۴۰
اسلامی احکام کی جامعیت ۱۴۱
سوالات ۱۴۳
بائیسواں سبق: تحریف قرآن کی نفی ۱۴۴
تحریف کے لغوی معنیٰ ۱۴۴
تحریف کی اصطلاحی تعریف ۱۴۴
نظریۂ تحریف کی بنیاد ۱۴۶
تحریفِ قرآن کے باطل ہونے کی ادلہ ۱۴۶
۱ ۔تاریخی شواہد ۱۴۷
۲ ۔قرآن کریم کا متواتر ہونا بدیہی ہے ۱۴۷
۳ ۔اعجازِ قرآن کا مسئلہ ۱۴۷
۴ ۔الٰہی ضمانت ۱۴۸
۵ ۔قرآن کریم، روایات کو پرکھنے کا معیار ہے ۱۴۸
۶ ۔اہل بیت علیہم السلام کی نصوص ۱۴۹
۷ ۔اکابر شیعہ علماء کا نظریہ ۱۴۹
سوالات ۱۵۱

حرف ناشر

آیۃ اللہ محمد ھادی معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ حوزہ علمیہ نجف اور حوزہ علمیہ قم کے چوٹی کے فقہاء، اساتذہ اور محققین میں سے شمار ہوتے ہے۔ بین الاقوامی علمی حلقوں خصوصاً مصر، لبنان اور شام میں ان کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ان کا تعلق جبل عامل لبنان کے ایک مشہور علمی گھرانے سے ہے۔ ان کے آباؤ اجداد برسوں پہلے لبنان سے ہجرت کر کے اصفہان میں آباد ہوئے۔

۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں آیۃ اللہ معرفت کے دادا آیۃ اللہ میرزا علی عبد العالی المیسی، اپنے اہل وعیال کو لے کر اصفہان سے کربلا آگئے۔ میرزا کے ہمراہ ان کے ۱۵ سالہ فرزند شیخ علی المیسی بھی تھے۔

آیۃ اللہ میرزا علی میسی، صاحب الرسالۃ المیسیہ، ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۵ء کو اصفہان میں پیدا ہوئے اور کربلاء میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا شمار حوزہ علمیہ کربلاء کے اکابر علماء، فقہاء اور خطباء میں ہوتا تھا۔

انہوں نے کربلاء میں ہی، مشہور سید گھرانے کے ایک تاجر سید ہاشم کی نیک اور صالح بیٹی سیدہ زہراء سے شادی کی یہ عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔

آیۃ اللہ محمد ھادی معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ /۴ شعبان المعظم ۱۳۴۹ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء بروز جمعرات کربلا معلیٰ میں آیت اللہ میرزا علی میسیؒ کے گھر میں پیدا ہوئے۔

آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے ۵ سال کے سن میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ کربلا کے مشہور اور مایہ ناز اساتید کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

انہوں کے جدید علوم کے ساتھ ساتھ عربی قواعد وادبیات، منطق، فلسفہ، ریاضیات، فلکیات، حدیث، فقہ وقرآن کے علوم میں مہارت حاصل کی۔

اس دوران آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے جن اساتید سے کسب فیض کیا ان میں کچھ یہ ہیں:

{۱} آیۃ اللہ شیخ باقرؒ
{۲} آیۃ اللہ شیخ علی اکبر نائینیؒ
{۳} آیۃ اللہ شیخ علی میسیؒ (والد گرامی)
{۴} آیۃ اللہ سید سعید تنکابنیؒ
{۵} آیۃ اللہ سید محمد شیرازیؒ
{۶} آیۃ اللہ شیخ محمد حسین مازندرانیؒ

{۷} آیۃ اللہ سید مرتضیٰ قزوینیؒ {۸} آیۃ اللہ شیخ محمد کلباسیؒ

{۹} آیۃ اللہ شیخ محمد طیبؒ {۱۰} آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ محمد رضا جرقوی اصفہانیؒ

{۱۱} آیۃ اللہ العظمیٰ سید حسن حاج آغامیر قزوینیؒ {۱۲} آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ یوسف بیار جندی خراسانیؒ

۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء میں پچیس برس کی عمر میں استاد ہادی معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ حوزہ علمیہ کربلا میں فقہ و اصول، علوم قرآن اور تفسیر میں اجتہاد کے بلند و برتر مرتبہ پر فائز ہوئے۔ اس وقت ان کا شمار کربلا کے درجہ اول کے اساتذہ اور فقہاء میں کیا جاتا تھا۔

دروس و مطالعات کے ساتھ ساتھ، استاد معظم پڑھانے اور تحقیق و تالیف نیز معاشرتی امور و معاملات میں بھی سرگرم عمل رہے۔

حوزہ علمیہ کے رائج دروس کے علاوہ ہفتہ میں ایک مرتبہ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کو ایک عمومی درس بھی دیتے تھے۔ جس میں استاد معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ انہیں معارف اسلام و قرآن سے روشناس کرواتے تھے۔ یوں انہوں نے حوزہ علمیہ کے دوسرے اساتذہ کی نسبت بہت جلد اور کم عرصے میں زیادہ شاگرد تربیت کئے۔

اسی دوران آیۃ اللہ معرفت نے ایک علمی گھرانے کی مقدس خاتون سے شادی کی۔ ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء میں آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے والد آیۃ اللہ میرزا علی المیسی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ والد کی رحلت کے بعد آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ حوزہ علمیہ کربلا سے حوزہ علمیہ نجف کی سمت روانہ ہوئے۔

استاد معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے علمی کارناموں اور تحقیقی شہرت کے سبب حوزہ علمیہ نجف کے اکابر علماء محققین اور دانشمندوں نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ یوں وہ وہاں کے علمائ، فضلاء اور طلباء کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ حوزہ علمیہ نجف میں قیام کے دوران استاد معرفت نے اس وقت کے اکابر فقہاء و علمائ:

{۱} آیۃ اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیم طباطبائیؒ {۲} آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئیؒ

{۳} آیۃ اللہ العظمیٰ میرزا باقر زنجانیؒ {۴} آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ حسین حلیؒ

{۵} آیۃ اللہ العظمیٰ حضرت امام سید روح اللہ الموسوی الخمینیؒ سے فیوض و برکات حاصل کیے۔ وہ ان اساتذہ کے دروس میں شرکت کے ساتھ ساتھ ان کے فقہی جلسوں اور ان کی مجلس فتاویٰ کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنی علمی کاوشوں کو انجام دیتے رہے۔ تحقیق، تدریس اور تالیف میں بھی مشغول رہے۔

آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے فقہ، اصول اور حدیث کے ساتھ ساتھ علوم قرآنی اور تفسیر پر بھی تحقیقی کام کیا۔ انہوں نے علوم قرآن اور تفسیر قرآن کو اپنی تحقیقی اور تصنیفی زندگی کا محور و مرکز قرار دیا۔

حوزہ علمیہ نجف و قم کے اساتذہ میں ان کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ وہ ہمیشہ فقہ و اصول کے شانہ بشانہ، علوم قرآن و تفسیر کی تدریس بھی کرتے رہے۔

علوم قرآنی میں ان کے تحقیقی نتائج میں سے جو اب تک شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے اہم یہ ہیں:

{۱} التمہید فی علوم القرآن ۷ جلدیں (عربی)
{۲} خلاصۃ التمہید ۲ جلدیں (عربی)
{۳} التفسیر و المفسرون ۲ جلدیں (عربی)
{۴} صیانۃ القرآن من التحریف ۱ جلد (عربی)
{۵} تفسیر قرآن و مفسران ۱ جلد (فارسی)
{۶} تاریخ قرآن ۱ جلد (فارسی)
{۷} علوم قرآنی ۱ جلد (فارسی)
{۸} تحریف ناپذیری قرآن ۱ جلد (فارسی)
{۹} نقد شبہات پیران قرآن کریم ۱ جلد (فارسی)
{۹} تفسیر الاثری الجامع متعدد جلدیں (عربی)

فقہ و اصول نیز معارف اسلامی میں استاد آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ علیہ کے تحقیقی کاموں میں چند یہ ہیں:

{۱} تمہید القواعد (عربی)
{۲} حدیث "لاتعاد" (عربی)
{۳} ولایۃ الفقیہ (عربی)
{۴} مالکیۃ الارض (عربی)
{۵} بازگشت روح (فارسی)
{۶} ولایت فقیہ، ابعادها و حدودها (فارسی)
{۷} ولایت تشریعی (فارسی)
{۸} ولایت تکوینی اولیاء اللہ (فارسی)
{۹} جامعہ مدنی (فارسی)

آج بھی حوزہ علمیہ قم، نجف، شام اور لبنان میں آیۃ اللہ استاد ھادی معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کا شمار صف اول کے فقہاء مفسرین، محدثین اور علماء میں ہوتا ہے۔ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے ساتھ "دانشگاہ قضا" کے نام سے جو یونیورسٹی ان فقہاء کے لیے تشکیل پائی تھی جن کو قضاوت (جج بننے) کی تربیت دی جاتی ہے۔ آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اس کے بانی اور سب سے پہلے وائس چانسلر تھے۔ آپؒ حوزہ علمیہ قم میں فقہ و اصول و تفسیر کی تدریس کے ساتھ تہران یونیورسٹی نیز آستان قدس رضوی کی یونیورسٹی بنام "دانشگاہ اسلامی رضوی" میں بھی علوم فقہ، اصول اور علوم قرآن کی تدریس میں مشغول رہے۔

آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے فقہ و اصول میں بڑی محنت اور ریاضت کی۔ انہوں نے گذشتہ صدی نیز اس صدی کے نصف اول کے تمام اکابر فقہاء، مجتہدین اور مراجع کے طرزِ اجتہاد، فتاویٰ نیز قرآن و حدیث، فقہ اور اصول کے بارے میں ان کے نظریات اور طرز عمل کو بڑے نزدیک سے دیکھا اور سمجھا۔ اسی طرح انہوں نے شیخ طوسیؒ سے اب تک کے فقہاء و مجتہدین و مراجع کے افکار و نظریات کو گہری نظر سے پرکھا۔ اس کے بعد انہوں نے خود اصول فقہ اور اجتہاد کے اصول و ضوابط پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں عصر حاضر کی ضرورتوں کے مطابق مدون و مرتب کیے نیز سالہا مطالعہ، فقہی عرق ریزی اور تحقیقات کی روشنی میں "احکام شرعی" کی کتاب تالیف فرمائی۔

آپؒ اس طویل علمی و تحقیقاتی سفر کے بعد 76 سال کی عمر میں 2007ء میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے لیکن ان کی شخصیت اور علمی و تحقیقاتی کام آج بھی زندہ ہے۔ حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ نے آیت اللہ معرفتؒ کے انتقال پر تعزیت پیش

کرتے ہوئے فرمایا کہ ''قرآن کریم کے محقق اور مفسر کی دردناک رحلت پر حوزہ علمیہ کے علماء اور فضلاء اور مرحوم کے خاندان اور فرزندوں کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔اس عالم جلیل القدر نے اپنی پر برکت زندگی میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور علوم قرآن کے سلسلے میں متعدد کتابیں تالیف کی ہیں اور دفاع مقدس کے دوران مجاہدت کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں جن میں ان کے فرزند کی شہادت قابل ذکر ہے خداوند اس خدمت گزار عالم دین پر اپنی رحمت اور بخشش نازل اور اُن کے درجات کو بلند فرمائے''۔

آیۃ اللہ معرفت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے علمی اور تحقیقاتی کاموں میں سے ایک کام کتاب ھٰذا ہے جو بڑی محنت اور دلچسپی کے ساتھ تالیف کی گئی ہے۔اور اس کتاب کی تدوین علوم قرآن کے اہم اور بنیادی مباحث کو تعلیمی نصاب کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے کی گئی ہے۔جس کا اہم ہدف مدارس دینی،قرآنی مراکز اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں تدریس کرنا ہے۔اسی کے پیش نظر اس کتاب کو جناب قاضی فیاض حسین علوی نے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

ادارہ التنزیل نے اس کتاب کی علمی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اشاعت کرنے کا ارادہ کیا۔اس سلسلے میں مترجم جناب قاضی فیاض حسین علوی کا شکرگزار ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے اس کتاب کی فیوض و برکات سے اردو زبان حضرات کو روشناس کرایا۔اسی طرح جناب سید نعیم الحسن نقوی صاحب کے شکرگزار ہیں کہ جنہوں نے تصحیح اور نظر ثانی کے فرائض انجام دیئے۔ادارہ توقع رکھتا ہے کہ قارئین حضرات ''علوم قرآن'' کو مفید،علمی اور درسی کتاب کی حیثیت سے پسند فرمائیں گے اور اس کی توسیعِ اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹا کر قرآن واہل بیت علیہم السلام کے ناصرین میں شامل ہوں گے۔

سربراہ ادارہ التنزیل

ڈاکٹر سید علی عباس نقوی

جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ رمئی 2011ء

مقدمہ مترجم

اگر چہ قرآنی علوم پر اب تک کافی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں لیکن یہ کتاب اپنے منفرد انداز اور خصوصیات کی وجہ سے امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں قرآنی علوم سے متعلق تمام موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی نظیر اردو زبان میں نہیں ملتی اسی لیے اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ایک اچھی کتاب نہ صرف شائقین مطالعہ کیلئے ذہنی سکون اور روحانی غذا فراہم کرتی ہے بلکہ ایک ایسا علمی سرمایہ ہے جس سے آئندہ نسلیں بھی فائدہ اٹھاتی ہیں۔

یہ "علوم قرآن" پر مشتمل مختصر اور جامع کتاب ہے جس میں مؤلف نے بڑی تحقیق اور باریک بینی سے ابتدائی منابع و مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ قابلِ ذکر امتیاز یہ ہے کہ مؤلف نے ہر قسم کے بغض و عناد اور مذہبی تعصبات سے اس کتاب کو دور رکھا ہے تاکہ اسلامی مقاصد اور مصالح کا اصول بدرجہ اتمّ حاصل ہو سکے۔ ان جیسی دیگر خصوصیات نے اس کتاب کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب علماء، محققین اور دانشوروں کے حلقہ میں علمی حوالے سے مشہور ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مختلف مواقع پر رہنمائی، ہمت افزائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

آخر میں خداوند متعال سے دعا گو ہوں کہ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسلامی تعلیمات کو صحیح معنوں میں سمجھنے، ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

ڈاکٹر فیاض حسین علوی

پہلا سبق

علومِ قرآن کا اجمالی تعارف

قرآن کریم واحد آسمانی کتاب ہے جو آغاز نزول سے لیکر قیامت تک کیلئے اپنی اصلی حالت پر باقی ہے۔ جس میں کسی قسم کی تغییر و تحریف اور ردّ و بدل کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ خداوند متعال نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ؛ ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ [۱]

''لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ؛ باطل نہ اس کے سامنے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے اور لائق ستائش کی نازل کردہ ہے۔ [۲]

خداشناسی کیلئے قرآن کریم کے متعلق بحث و گفتگو ایک لازمی امر ہے۔ آیندہ موضوعات کے متعلق گفتگو سے پہلے قرآنی علوم اور تفسیر قرآن کا باہمی فرق جاننا ضروری ہے۔ لہٰذا پہلے قرآنی علوم کی تعریف، اس کا تاریخی پس منظر اور اجمالی طور پر اس موضوع کے متعلق لکھی جانے والی چند اہم کتابوں کا ذکر پیش خدمت ہے۔

ابتدائی طور پر قرآنی معارف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قرآن مجید سے متعلقہ معارف (ایسے معارف جو قرآن کریم کے بارے میں ہیں)۔

۲۔ قرآن مجید سے اخذ شدہ معارف (ایسے معارف جنہیں قرآن کریم سے لیا اور اخذ کیا گیا ہے)۔

کبھی ہم قرآن کریم کے قابل شناخت اور قابل تحقیق ہونے کے عنوان سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ:

قرآن کریم کیسے نازل ہوا؟

اس کی جمع و تدوین کیسے ہوئی؟

۱) سورۂ حجر/آیت ۹

۲) سورۂ حم سجدہ/آیت ۴۲

قرآن کریم نے کن مراحل سے گذر کر یہ موجودہ شکل اختیار کی ہے؟

اور کبھی قرآن کریم کے دوسرے قابل غور پہلوؤں سے اس کا مطالعہ و تحقیق کرتے ہیں جیسا کہ:

قرآن کریم کی آیات کا آپس میں کیا رابطہ ہے؟

کیا قرآن کریم کی بعض آیتیں اس کی بعض دوسری آیتوں کی وضاحت اور تفصیل بیان کرتی ہیں؟

کیا مجموعی طور پر قرآن کریم کی آیات کا آپس میں ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، عام و خاص، محکم و متشابہ جیسا رابطہ پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اگر اس سوال کا جواب مثبت ہے تو کون سی آیات ہیں جو ان مذکورہ تقسیمات پر مشتمل ہیں؟

اور اعجازِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ تاریخ تفسیر، عظیم مفسرین، تفسیری طریقوں اور روشوں سے آشنائی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

لفظ علم کی جمع علوم ہے اور ''علوم قرآن'' کے عنوان میں جمع کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ ان موضوعات میں سے ہر موضوع اپنی وسعت اور جمع بندی کے لحاظ سے ایک علیحدہ اور مستقل موضوع ہے۔ جیسا کہ علم اعجاز قرآن، علم تجوید، علم قرائت، علم تاریخ قرآن وغیرہ۔ ان سب علوم میں مشترک بات یہ ہے کہ ''یہ ایسے مباحث ہیں کہ جو مختلف پہلوؤں سے قرآن کریم کی شناخت سے مربوط ہیں''۔

قرآنی معارف کی دوسری قسم، قرآن کریم کے اندرونی مطالب اور مضامین سے متعلق ہے۔ جسے ''تفسیر قرآن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تفسیر قرآن اپنے خاص طریقوں کے تحت انجام پاتی ہے۔ لہٰذا مفسر قرآن کو تمام قرآنی علوم پر دسترس ہونی چاہیے۔

مذکورہ بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تفسیر قرآن کا مطالعہ کرنے سے پہلے قرآنی علوم سے آشنائی ضروری ہے۔ اسی بنا پر صدرِ اسلام ہی سے (پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد) قرآنی علوم اور تفسیر قرآن جیسے اہم موضوعات پر بہت سی عظیم شخصیات گزری ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور اہل بیت علیہم السلام میں سے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام جیسی جلیل القدر اور باعظمت شخصیت کو سب پر سبقت حاصل ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) اس بارے لکھتے ہیں: ''صحابہ کرامؓ میں سے تفسیر قرآن سے متعلق سب سے زیادہ مطالب حضرت علی بن ابی طالبؑ نے روایت کیے ہیں۔ آپؑ کے بعد اس موضوع پر صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور اُبیِ بن کعبؓ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں''۔

علوم قرآن کا تاریخی جائزہ

قرآنی علوم کا تاریخی پس منظر دوسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ قرآنی علوم کے متعلق تحقیق و تألیف کا سلسلہ نزول قرآن کے آغاز سے جاری ہے۔ کیونکہ قرآن کریم سے متعلق مسائل کی شناخت کے بارے میں بحث و گفتگو صدرِ اسلام ہی سے رائج تھی۔ پوری تاریخ میں ہمیشہ بہت سی عظیم علمی شخصیات، محققین اور مفسرین نے اس بارے میں بحث و گفتگو کی ہے۔ بعض نے تفاسیر قرآن کے مقدمہ میں ان علوم پر اظہارِ نظر کیا ہے یا پھر مستقل طور پر جداگانہ بہت سے عمدہ اور قیمتی قلمی آثار یادگار کے طور پر چھوڑے

ہیں اور جامع و مفصل کتابیں تالیف کی ہیں۔

علوم قرآن پر سب سے پہلے ابوالاسود دوئلی (متوفی ۸۹ھ) کے شاگرد ''یحیی بن یعمر'' نے تحقیق و تالیف کا آغاز کیا اور ''فن قرائت'' کے نام سے کتاب لکھی۔ جو اس زمانہ میں رائج مختلف قرائتوں پر مشتمل تھی۔ان کے بعد ''حسن بصری'' (متوفی ۱۱۰ھ) نے قرآنی آیات کی تعداد سے متعلق کتاب تالیف کی۔اس کے بعد تالیف و تصنیف کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ گیارہویں صدی کے بعد قرآنی علوم پر بہت زیادہ کتابیں لکھی گئیں۔

علوم قرآن پر اہم تصانیف

علوم قرآن پر موجود تمام کتابوں اور قلمی آثار میں سے بنیادی طور پر دو کتابیں ''البرھان'' اور ''الاتقان'' سب سے زیادہ اہم ہیں۔

۱۔البرھان فی علوم القرآن

یہ کتاب شیخ بدرالدین زرکشی کی تالیف ہے۔جن کا شمار آٹھویں صدی کے مشہور علماء اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔آپ (۷۴۵ھ) میں مصر کے دارالخلافہ قاہرہ میں پیدا ہوئے۔اسی شہر میں پرورش پائی اور مختلف اسلامی علوم و فنون میں ایک استاد کی حد تک تعلیم حاصل کی۔آپ کی کتاب ''البرھان فی علوم القرآن'' کا شمار علوم قرآن پر موجود اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔جس میں قرآنی علوم کی وسیع و عریض بحثیں بڑے خوبصورت انداز میں مختصر طور پر بیان ہوئی ہیں۔اس کتاب میں قرآنی علوم کی سنتالیس (۴۷) اقسام بیان ہوئی ہیں اور ہر موضوع سے متعلق تمام مطالب کی منظم طور پر جمع آوری کی گئی ہے۔گویا انہوں نے اس کام میں اپنے اسلاف اور قدماء پر سبقت حاصل کی ہے اور آیندہ نسلوں کیلئے ایک گرانقدر اور نایاب نمونہ چھوڑا ہے۔

۲۔الاتقان فی علوم القرآن

یہ کتاب نویں صدی کے جلیل القدر عالم جلال الدین عبدالرحمن سیوطی کی شہرۂ آفاق تالیف ہے۔آپ (۸۹۴ھ) مصر کے شہر السیوط میں پیدا ہوئے اور آپ نے (۹۴۴ھ) قاہرہ میں وفات پائی۔انہیں حدیث اور تفسیر کے تمام علوم اور دوسرے اسلامی علوم پر بڑی مہارت حاصل تھی۔آپ نے بہت سی قیمتی اور نایاب تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔اس کتاب میں قرآنی علوم کی اسی (۸۰) اقسام بیان ہوئی ہیں۔جو اعلیٰ اور علمی مطالب پر مشتمل ہیں۔قرآنی علوم کے موضوع پر اس وقت یہ کتاب ایک جامع ترین ماخذ کے عنوان سے محققین اور دانشور حضرات کیلئے قابل استفادہ ہے۔

دورِ حاضر میں متعدد علماء اور بالخصوص شیعہ دانشوروں نے اس موضوع پر مفصل اور منظم کتابیں لکھی ہیں جن میں سے آیۃ اللہ العظمیٰ السید ابوالقاسم خوئیؒ کی مشہور تالیف ''البیان فی تفسیر القرآن'' قرآنی علوم کے موضوع پر نہایت عمدہ اور جامع کتاب ہے۔جس میں اعلیٰ علمی تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ کتاب ''التمھید فی علوم القرآن'' ہے جس میں مصنف نے صرف فریقین کے علماء اور محققین کے مختلف اقوال و نظریات کو نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ دلیل و برہان کا بہترین طریقہ اختیار کرتے

ہوئے بڑی جرأت اور اطمینان کے ساتھ اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ جو طالبانِ حق و حقیقت کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ یہ کتاب علوم قرآن کا ایک جامع اور مکمل دورہ ہے۔ جس میں مصنف نے بڑی تحقیق اور باریک بینی سے علمی استدلال کیے ہیں اور منابع اوّلیہ سے استفادہ کیا ہے۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے علماء و محققین اور دانشور حضرات نے اسے بہت سراہا ہے اب یہ کتاب ایک بنیادی منبع اور ماخذ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

سوالات

۱۔ قرآنی علوم کی تعریف کریں اور بتائیں اس میں لفظ ''علوم'' جمع کا صیغہ کیوں استعمال ہوا ہے؟

۲۔ قرآنی علوم کے موضوع پر بات کرنے کی کیوں ضرورت ہے؟

۳۔ پانچ ایسے موضوعات بیان کریں جو قرآنی علوم میں موضوع بحث بنتے ہیں؟

۴۔ قرآنی علوم سے متعلق چند اہم کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام بیان کریں؟

وحی کی حقیقت

وحی کی بحث اس لیے اہم ہے کہ یہ کلام الٰہی کی شناخت کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید جو کلام الٰہی بیان کرنے والا اور آسمانی پیغام کا حامل ہے وحی کے ذریعہ نازل ہوا ہے۔ وحی کی شناخت اور عالم بالا کے اس عالم مادہ سے رابطہ پر بحث و گفتگو جیسے موضوعات قرآنی مضامین کو صحیح طور پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

وحی کے لغوی معنیٰ

لغت کی کتابوں میں لفظ وحی مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اشارہ کرنا، لکھنا، مکتوب، خط، پیغام، پوشیدہ کلام، چپکے سے کچھ کہنا، جلد، تیزی اور ہر وہ چیز جسے تحریر یا اشارہ کے ذریعہ کسی شخص تک (کسی دوسرے کے متوجہ ہوئے بغیر) پہنچایا جائے یہ سب ''وحی'' کے مختلف معانی ہیں۔

مشہور ماہرِ لغت، راغب اصفہانی کہتے ہیں: ''وحی ایک ایسا مخفیانہ پیغام ہے جو اشارہ کی طرح تیزی سے انجام پاتا ہے''۔ [1]

قرآن مجید میں وحی کا استعمال

قرآن کریم میں لفظ وحی چار معنوں میں استعمال ہوا ہے:

ا۔ مخفی اشارہ: وہی لغوی معنی مراد ہے جیسا کہ حضرت زکریا کے متعلق قرآن مجید میں ہے۔ جب انہوں نے چُپ کا روزہ رکھا ہوا تھا:

''فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا'' پھر وہ محراب عبادت سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ [2]

---

۱) المفردات فی غریب القرآن؛ ص ۵۱۵

۲) سورۂ مریم/آیت ۱۱

۲۔ فطری ہدایت: یعنی وہ ہدایت جو تمام موجودات کی فطرت وخلقت میں رکھی گئی ہے۔ تمام موجودات (جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان) فطری طور پر اپنی بقاء کے راستے اور زندگی بسر کرنے کے طریقے کو جانتے ہیں۔

اسی فطری ہدایت کو قرآن مجید میں ''وحی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے:

''وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ؛ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا؛ اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں گھر (چھتے) بنائے پھر ہر قسم کے پھل (کا رس) چوس لے اور اپنے پروردگار کی طرف سے تسخیر کردہ راہوں پر چلتی جائے''۔ [1]

۳۔ الہام: (ندائے غیبی) کبھی انسان ایسے پیغام کو دریافت کرتا ہے کہ جس کے منبع کو نہیں جانتا۔ بالخصوص اضطراری حالت میں کہ جب انسان خیال کرتا ہے کہ اب کوئی راہ نجات نہیں ہے تو اچانک اس کے دل میں ایک روشنی اور امید پیدا ہوتی ہے۔ جو اس کیلئے راہ روشن کر دیتی ہے اور اسے مشکل سے نجات دیتی ہے۔ یہ راہ ہموار کرنے والے پیغام وہی ندائے غیبی ہے جو پردہ غیب سے ظاہر ہو کر انسان کی مدد کو پہنچتی ہے۔ یہ غیبی آواز لطف الٰہی سے وجود میں آتی ہے اور اسے بھی قرآن کریم میں ''وحی'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں فرماتا ہے:

''وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّۃً اُخْرٰی؛ اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی؛ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ؛ اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُکَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَنْ یَّکْفُلُهٗ فَرَجَعْنٰکَ اِلٰٓی اُمِّکَ کَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ؛ اور ہم نے تم پر ایک اور احسان کیا ہے جب ہم نے تمہاری ماں کی طرف خاص وحی کی کہ اپنے بچہ کو صندوق میں رکھ دو اور پھر صندوق کو دریا کے حوالے کر دو، موجیں اسے ساحل پر ڈال دیں گی اور ایک ایسا شخص اسے اٹھالے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ کا بھی دشمن ہے اور ہم نے تم پر اپنی محبت کا عکس ڈال دیا تا کہ تمہیں ہماری نگرانی میں پالا جائے اس وقت کو یاد کرو جب تمہاری بہن جا رہی تھی کہ فرعون سے کہے: کیا میں کسی ایسے کا پتہ بتاؤں جو اس کی کفالت کر سکے؟ اس طرح ہم نے تمہیں تمہاری ماں کی طرف پلٹا دیا تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ رنجیدہ نہ ہو''۔ [2]

ان آیات کی روشنی میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ ان کے بارے میں بہت پریشان تھیں۔ اچانک ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ خدا پر توکل کرتے ہوئے اسے دودھ پلائیں اور جیسے ہی کوئی خطرہ محسوس کریں تو اسے لکڑی کے صندوق میں ڈال کر پانی میں چھوڑ دیں اور مطمئن رہیں کہ ان کا بچہ انہیں مل جائے گا۔ اس بارے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو حضرت موسیٰ ؑ کی والدہ کے ذہن میں آئیں اور امید کی کرنیں تھیں جو اس کے دل و دماغ میں چمک اٹھیں۔

---

۱) سورہ نحل / آیت ۶۹۔۶۸

۲) سورہ طٰہٰ / آیت ۴۰۔۳۷

راہ روشن کرنے والے اور خوف و ہراس سے نجات دلانے والے ایسے پیام صرف رحمٰن و رحیم کے الہام اور رب کریم کی عنایتوں کا نتیجہ ہیں جو ضروری مواقع پر نیک اور صالح افراد کی مدد کیلئے ہوتے ہیں۔

البتہ قرآن کریم میں وحی کی یہ قسم (یعنی الہام یا غیبی آواز) شیطانی وسوسوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوئی ہے:

"وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ؛ اور شیاطین تو اپنے دوستوں کی طرف خفیہ اشارے کرتے ہی رہتے ہیں تا کہ وہ تم سے بحث کریں"۔ [1]

۴۔ وحی نبوی: وحی اس معنیٰ میں نبوت کی علامت اور نشانی ہے۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ستّر (۷۰) مرتبہ سے کہیں زیادہ ہوا ہے؛ مثال کے طور پر "وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا؛ اور ہم نے اسی طرح آپ کی طرف عربی زبان میں قرآن کی وحی بھیجی تا کہ آپ مکہ اور اس کے گرد و پیش میں رہنے والوں کو تنبیہ کریں"۔ [2]

انبیاء الٰہی ایسے انسان کامل ہوتے ہیں جو حصول وحی کے لیے پہلے سے اپنے کو آمادہ رکھتے ہیں۔

اسی بارے میں امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللهَ وَجَدَ قَلْبَ مُحَمَّدٍ اَفْضَلَ الْقُلُوْبِ وَ اَوْعَاهَا فَاخْتَارَهَا لِنُبُوَّتِهٖ؛ خداوند متعال نے پیغمبر اکرم ﷺ کے قلب مبارک کو سب سے افضل اور اہل پایا تب اسے نبوت کیلئے انتخاب کیا"۔ [3]

پیغمبر اکرم ﷺ کا فرمان ہے: خدا نے کسی بھی نبی یا رسول کو مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ اس کی عقل پوری امت کی عقلوں سے افضل و برتر اور درجہ کمال تک پہنچ چکی ہو۔ [4]

ملا صدرالدین شیرازی کے بقول: اس سے پہلے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ظاہری طور پر نبوت سے مزین ہوں باطنی طور پر نبوت کی حقیقت پا چکے تھے۔ [5]

وحی اور الہام میں فرق

وحی کا اطلاق بھی الہام کی مانند خاص مواقع میں باطن اور اندرونی حالت کے روشن اور تابناک ہونے پر ہوتا ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ الہام پانے والے پر اس (الہام) کا سرچشمہ پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وحی کے دریافت کرنے والے انبیاء کیلئے اس وحی کا

---

۱) سورۂ انعام / آیت ۱۲۱

۲) سورۂ شوریٰ / آیت ۷

۳) بحار الانوار؛ جلد ۱۸، ص ۲۰۵، حدیث ۳۶

۴) اصول کافی؛ جلد ۱، ص ۱۳

۵) شرح اصول کافی؛ جلد ۳، ص ۴۵۴

سرچشمہ واضح وروشن ہوتا ہے۔اسی لیےکبھی بھی انبیاء الٰہی اس آسمانی پیغام کے دریافت کرنے میں کسی بھی طرح کے تعجب اور شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ وہ مکمل طور پر وحی کے منبع اور اس کے انجام پانے کی کیفیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔

جناب زرارہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا: پیغمبر اکرم ﷺ کس طرح مطمئن تھے کہ جو کچھ ان پر نازل ہو رہا ہے وہ وحی الٰہی ہے نہ کہ شیطانی وسوسے؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

جب بھی خداوندمتعال اپنے کسی بندے کو رسالت کیلئے منتخب کرتا ہے تو اس پر ایک خاص اطمینان وسکون کی کیفیت طاری کرتا ہے۔پس ہر وہ چیز جو خداوندمتعال کی جانب سے اس پر نازل ہوتی ہے اس طرح سے ہوتی ہے کہ گویا وہ اسے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔[1]

عام لوگوں میں سے پیغمبر اکرم ﷺ کے مبعوث ہونے پر پیدا ہونے والے ہر طرح کا تعجب اور وہم وگمان دور کرنے کیلئے خداوندمتعال نے فرمایا ہے:

"ہم نے آپ کی طرف اس طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی اور ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اولاد یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی کی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی ہے۔ کچھ رسول ہیں جن کے قصے ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور کچھ رسول ہیں جن کا تذکرہ ہم نے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰؑ سے باقاعدہ گفتگو کی ہے۔یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے سب اس لیے بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہونے پائے اور خدا سب پر غالب اور صاحب حکمت ہے۔لیکن خدا نے جو کچھ آپ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور ملائکہ بھی گواہی دیتے ہیں اور خدا خود گواہی کیلئے کافی ہے۔ بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور راہِ خدا سے روکا وہ گمراہی میں بہت دور چلے گئے ہیں"۔[2]

پس انسانوں میں سے کسی ایک پر وحی ہونا کوئی حیرت انگیز اور تعجب آور بات نہیں ہے۔کیونکہ یہ ایسی چیز ہے کہ جو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے اور انسانوں کا بھی پوری تاریخ میں اس سے ہمیشہ واسطہ رہا ہے۔

وحی رسالی کی اقسام

قرآنی نقطہ نگاہ میں وحی نبوی تین صورتوں سے باہر نہیں ہے:

"وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ

[1] بحار الانوار؛ جلد ۱۸، ص ۲۶۲، حدیث ۱۶

[2] سورۂ نساء، آیت ۱۶۷ _ ۱۶۳

وَ کَذٰلِکَ اَوْحَینَا اِلَیکَ رُوْحًا مِنْ اَمْرِنَا؛ اور کسی انسان کیلئے یہ بات نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر یہ کہ وحی کرے یا پس پردہ بات کرے یا کوئی نمائندہ فرشتہ بھیج دے اور وہ اسکی اجازت سے جو وہ چاہتا ہے وہ پیغام پہنچا دے کہ وہ بلند و بالا اور صاحبِ حکمت ہے اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی کی ہے۔[1]

۱۔وحی مستقیم: پیغمبر اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک پر بغیر کسی واسطے براہ راست خدا کی طرف سے وحی کا القاء ہونا "وحی مستقیم" ہے۔

رسول اکرم ﷺ اس بارے فرماتے ہیں:

"اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ یَنْفَثُ فِیْ رُوْعِیْ؛ بے شک روح القدس میرے اندر پھونکتا ہے"۔[2] اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ روح القدس سے مراد جبرئیل کے علاوہ کوئی اور ہے۔

۲۔آواز کے ذریعے: پیغمبر اکرم ﷺ کے مبارک کانوں تک اس طرح وحی کا پہنچنا کہ آپؐ کے علاوہ کوئی دوسرا سن نہ سکے۔ صاحب آواز کو دیکھے بغیر آواز کا سننا بالکل ایسے ہے جیسے کوئی پس پردہ گفتگو کر رہا ہو یہی وجہ ہے کہ مذکورہ آیت میں اسے "اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسی ہی وحی حضرت موسیٰؑ پر بالخصوص کوہِ طور پر اور نبی اکرم پر شبِ معراج نازل ہوئی۔

۳۔فرشتے کے ذریعے: جبرائیلؑ، پیغمبر اکرم ﷺ کے دل وجان پر پیامِ الٰہی نازل کیا کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

"نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ؛ عَلٰی قَلْبِکَ؛ اسے جبرائیلؑ امین لے کر نازل ہوئے ہیں یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے"۔[3]

نزولِ وحی کی کیفیت

پیغمبر اکرم ﷺ پر جب وحی مستقیم (بلاواسطہ) نازل ہوتی تھی تو وہ خود پر بوجھ محسوس کرتے تھے اور اس کی شدت کی وجہ سے آپؐ کا بدن مبارک بہت گرم و سرخ ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی پیشانی مبارک سے پسینہ بہنے لگتا تھا اور اگر آپ ﷺ کسی اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہوتے تو اس کی کمر بہت زیادہ خم ہوجاتی تھی۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جب پیغمبر اکرم ﷺ پر سورہ مائدہ نازل ہوئی تو اس وقت آنحضرت ﷺ ایک "شہباء" نامی خچر پر سوار تھے۔ اس دوران آپؐ پر وحی کا بوجھ اس قدر سنگین تھا کہ وہ جانور اپنی جگہ رک گیا اور اس کا پیٹ نیچے کی طرف لٹک گیا اور زمین کے بہت قریب ہوگیا۔

---

۱) سورۂ شوریٰ/آیت ۵۲۔۵۱

۲) الاتقان؛ جلد ۱، ص ۴۴

۳) سورۂ شعراء/آیت ۱۹۳۔۱۹۴

اس صورتحال میں جب پیغمبر اکرم ﷺ عام حالت میں نہ تھے تو انہوں نے اپنا دستِ مبارک ایک صحابی کے سر پر رکھا۔ [1]

عبادۃ بن صامت کہتے ہیں:

جب پیغمبر اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آنحضرت کا چہرہ اقدس متغیر اور ان کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ اپنے سر اقدس کو نیچے کی طرف کر لیتے اور آپ ﷺ کی خدمت میں موجود سب صحابہ کرامؓ بھی احترام سے اپنا سر جھکا لیتے تھے۔ [2]

پیغمبر اکرم ﷺ کی ایسی صورتحال کیوں ہو جاتی تھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ہم وحی کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ لہٰذا تفصیل کیلئے ان کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے جو وحی اور اسکی کیفیت کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ [3]

سوالات

۱۔ وحی کے لغوی معنی کیا ہیں اور قرآن کریم میں وحی کن معنوں میں استعمال ہوئی ہے؟

۲۔ آیہ مجیدہ ''وَاِنَّ الشَّیَاطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَولِیَائِھِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ'' میں وحی کس معنی میں استعمال ہوئی ہے؟

۳۔ جب وحی الہام کی مانند ہے تو پھر انبیاء وحی کے دریافت کرنے میں پریشانی اور غلطی کا شکار کیوں نہیں ہوتے تھے؟

۴۔ وحی نبوی کی قسمیں بیان کرتے ہوئے اُن کی تعریف کریں؟

۵۔ وحی مستقیم کے نزول کے وقت پیغمبر اکرم ﷺ کی کیفیت کیا ہوا کرتی تھی؟

---

[1] طبقات ابن سعد؛ جلد ۱، ص ۱۳۱

[2] طبقات ابن سعد؛ جلد ۱، ص ۱۳۱

[3] التمہید فی علوم القرآن؛ جلد ۱، ص ۶۶ کے بعد

تیسرا سبق

نزولِ قرآن

قرآن مجید اُن آیتوں اور سورتوں کا مجموعہ ہے جو پیغمبر ﷺ اسلام پر، ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد مختلف مناسبتوں سے نازل ہوئیں۔ پھر انہی آیات اور سورتوں کو اکٹھا کر کے ایک کتابی شکل دے دی گئی۔ قرآن مجید تدریجی طور پر، آیت آیت اور سورہ سورہ کر کے پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کے آخری سال تک نازل ہوتا رہا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی میں جب کبھی کوئی واقعہ رونما ہوتا یا مسلمانوں کو کوئی مشکل پیش آتی تو اس واقعے کے متعلق یا اس مشکل کو دور کرنے یا بعض اوقات آپ ﷺ سے کیے جانے والے سوالات کے جواب کے طور پر کچھ آیتیں یا کوئی سورہ نازل ہوتی تھی۔ قرآن مجید کا اس طرح مختلف اوقات میں تدریجاً نازل ہونا اسے دوسری آسمانی کتابوں سے ممتاز کرتا ہے۔ کیونکہ صُحفِ ابراہیم علیہ السلام اور الواحِ موسیٰ یکجا طور پر اکٹھی نازل ہوئیں اور قرآن کا تدریجی نزول مشرکوں کی عیب جوئی کا سبب بنا۔

جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہوا ہے:

''وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً؛ اور کافر کہتے ہیں کہ آخر یہ قرآن ان پر ایک ہی دفعہ پورے کا پورا کیوں نہیں نازل ہوا''۔[۱]

خداوندِ متعال نے اُن (مشرکوں) کا جواب اس طرح دیا ہے:

''كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا؛ ہم اسی طرح تدریجاً نازل کرتے ہیں تاکہ تمہارے دل کو مطمئن کرسکیں اور ہم نے خود اسے ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے''۔[۲]

قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشادِ ربّ العزت ہے:

''وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا؛ اور ہم نے قرآن کو جدا جدا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم تھوڑا تھوڑا لوگوں کے سامنے پڑھو اور ہم نے اسے تدریجاً نازل کیا''۔[۳]

---

[۱] سورہ فرقان/آیت ۳۲

[۲] سورہ فرقان/آیت ۳۲

[۳] سورہ بنی اسرائیل/آیت ۱۰۶

جو کچھ خود قرآن مجید سے سمجھ میں آتا ہے اس کے مطابق قرآن مجید کے تدریجاً (ٹھہر ٹھہر کے اور تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل ہونے کا فلسفہ اور حکمت یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اور مسلمان یہ محسوس کریں کہ ہمیشہ خداوند متعال کا خاص لطف و کرم ان کے شاملِ حال اور ان کا رابطہ خداوند متعال سے مسلسل برقرار ہے۔ جیسا کہ بہت سے مقامات پر قرآنی آیات کی وحی پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے سکونِ قلب کا سبب بنی ہے۔

نزولِ قرآن کا آغاز

نزولِ قرآن کا آغاز رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ اور شب قدر میں ہوا ہے: ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ؛ رمضان المبارک ایسا مہینہ ہے کہ جس میں قرآن کو نازل کیا گیا۔[1] ''إِنَّآ أَنزَلْنَاهُ فِى لَيْلَةِ الْقَدْرِ؛ ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا''۔ [2]

شیعہ امامیہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے کہ شبِ قدر رمضان المبارک کی اکیسویں (۲۱ویں) رات ہے یا تیئیسویں (۲۳ویں)؟

حسان بن مہر سے مرحوم کلینیؒ روایت کرتے ہیں کہ اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ شبِ قدر کون سی رات ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: اسے (شبِ قدر کو) ان دو راتوں (۲۱ویں اور ۲۳ویں) میں سے کسی ایک میں جستجو کرو۔ [3]

زرارہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

انیسویں کی رات، شبِ تقدیر ہے، اکیسویں کی رات، شبِ تعیین ہے اور تیئیسویں کی رات، امور کے حتمی ہونے کی رات ہے۔ [4]

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

ہمارے بزرگ علماء اور مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ شبِ قدر، رمضان المبارک کی تئیسویں (۲۳ویں) کی رات ہے۔ [5]

نزولِ قرآن میں تین سال کی تاخیر

اگرچہ وحی نبوی (بعثتِ پیغمبر اکرم ﷺ) کا آغاز، ہجرت سے تیرہ (۱۳) سال پہلے ۶۰۹ عیسوی میں ستائیس (۲۷) رجب کو ہوا۔

---

[1] سورۂ بقرہ/آیت ۱۸۵

[2] سورۂ قدر/آیت ۱

[3] وسائل الشیعہ؛ ج ۷، ابواب احکام شھر رمضان، باب ۳۲، حدیث ۲-۱

[4] التھذیب؛ ج ۴، ص ۳۳۰، شمارہ نمبر ۱۰۳۲

[5] الخصال؛ ج ۲، ص ۱۰۲/التمہید، ج ۱، ص ۱۰۹-۱۰۸

لیکن آسمانی کتاب کے عنوان سے قرآن مجید کا نزول تین سال بعد ہوا۔ اس تین سال کے عرصہ کو ''فترتِ وحی'' یعنی وحی کے منقطع ہونے کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس دوران پیغمبر اکرم ﷺ دعوتِ اسلام کو مخفیانہ اور چھپ کر انجام دیتے تھے۔ یہاں تک کہ آیت ''فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ''[۱] نازل ہوئی اور پیغمبر اکرم ﷺ کو کھلے عام دعوتِ اسلام دینے کا حکم ملا۔

ابو عبداللہ زنجانی کہتے ہیں: آیت ''اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ''[۲] نازل ہونے کے بعد تین سال تک نزولِ قرآن کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس مدت کو ''فترتِ وحی'' کہتے ہیں اس کے بعد قرآن تدریجاً نازل ہونا شروع ہوا۔[۳]

نزولِ قرآن کی مدت

قرآن مجید کے تدریجی طور پر نازل ہونے کی مدت بیس (۲۰) سال ہے۔ یہ سلسلہ پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت کے تین سال بعد سے لے کر آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری سال تک باقی رہا۔

یہاں پر تین سوال پیدا ہوتے ہیں: ۱۔ نزولِ قرآن یا اس کا آغاز شبِ قدر میں کیسے ہوا جبکہ ستائیس (۲۷) رجب کو سورہ علق کی پہلی پانچ آیتوں کے نزول کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت کا آغاز ہو گیا تھا؟

۲۔ پہلی بار کون سی سورہ یا کون سی آیات پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوئیں اگر پہلی سورہ اور پہلی آیات، سورہ علق اور اس کی پہلی پانچ آیات ہیں تو پھر سورہ حمد کو ''فَاتِحَۃُ الۡکِتَاب'' کیوں کہا جاتا ہے؟

۳۔ نزولِ قرآن شبِ قدر میں کیسے انجام پایا حالانکہ قرآن مجید بیس سال کے عرصہ میں مختلف مناسبتوں، حوادث اور واقعات کے پیشِ نظر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے؟

پہلے سوال کا جواب

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے نزولِ قرآن کا آغاز، بعثت کے تین سال بعد ہوا۔ زمانِ بعثت میں نازل ہونے والی سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات قرآن کے عنوان سے نہ تھیں بلکہ بعد از اں جب یہ سورہ مکمل طور پر نازل ہوئی تو قرآن کا جزء قرار پائی۔ جب آیت ''فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ''[۴] نازل ہوئی تو نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پیغمبر اکرم ﷺ کو علی الاعلان دینِ اسلام کی دعوت دینے کا حکم ملا اس کے بعد قرآن کریم کی آیات اور سورتیں مسلسل نازل ہوتی رہیں۔

---

۱) سورۂ حجر/آیت ۹۴

۲) سورہ علق/آیت ۱

۳) تاریخ القرآن، ص ۹

۴) سورۂ حجر/آیت ۹۴

دوسرے سوال کا جواب

اگر سورہ حمد کے لیے ''فَاتِحَۃُ الْکِتَاب'' کا اطلاق پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں ہوتا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ حمد پیغمبر اکرم ﷺ پر یکجا مکمل طور پر نازل ہونے والی سب سے پہلی سورہ ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ بعثت کے پہلے دن ہی جبرائیل نے پیغمبر اکرم ﷺ کو اسلامی آئین کے مطابق وضو اور نماز کی تعلیم دی تھی۔ کیونکہ ''لَا صَلَاۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب؛ سورہ حمد کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی'' اسی وجہ سے سورہ حمد بطورِ کامل یکجا نازل ہوئی۔ [1]

تیسرے سوال کا جواب

شب قدر میں قرآن کے مکمل نازل ہونے اور رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں ۲۰ سال میں تدریجاً نازل ہونے کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر متعدد آراء ونظریات بیان کیے گئے ہیں جنہیں یہاں مختصر طور پر نقل کیا گیا ہے۔

پہلا نظریہ: نزولِ قرآن کا آغاز شبِ قدر میں ہوا (نہ کہ پورے قرآن کا نزول) جیسا کہ آیت ''شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِی اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ'' [2] کے ظاہر سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

اکثر محققین کا نظریہ یہی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے وقت اس دور کے لوگ لفظِ قرآن سے مکمل قرآن نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ خود قرآن مجید ان الفاظ، عبارات اور خصوصیات کے ساتھ ایک ہی رات میں اکٹھا نازل نہیں ہوسکتا ہے، مثال کے طور پر بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں قرآن مجید گذرے ہوئے حالات اور واقعات کے بارے میں خبر دے رہا ہے اگر انہی آیات کو پہلی شبِ قدر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ (آیات) مستقبلِ بعید شمار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس آیت کو ملاحظہ فرمائیں:

''وَ لَقَدْ نَصَرَ کُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ؛ اور بتحقیق اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی ہے جبکہ تم کمزور تھے''۔ [3]

قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں جو ماضی کی خبر دیتی ہیں اور اگر ان آیات کا نزول پہلی شبِ قدر میں ہوتو انہیں مستقبل کی صورت میں ہونا چاہیے تھا وگرنہ بات اپنی ظاہری حقیقت سے دور ہوجائے گی۔

اس مذکورہ استدلال کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سی آیات، ناسخ ومنسوخ، عام وخاص، مطلق ومقید اور مجمل ومبین ہیں۔ حالانکہ نسخ کا تقاضا یہ ہے کہ ناسخ آیت زمانہ کے لحاظ سے منسوخ آیت کے بعد ہونی چاہیے۔ یہی صورتحال مطلق ومقید اور خاص طور پر مجمل ومبین کی بھی ہے۔ کیونکہ مجمل کو بیان کرنے کا طبیعی لازمہ یہ ہے کہ ان میں زمانہ کے لحاظ سے فاصلہ پایا جاتا ہو۔ پس یہ بات

---

۱) غوالی اللئالی، ج ۱، ص ۱۹۶

۲) سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۵

۳) سورۂ آل عمران، آیت ۱۲۳

بالکل غیر معقول ہے کہ موجودہ قرآن ایک ہی دفعہ یکجا نازل ہوا ہے۔

دوسرا نظریہ: ایک گروہ اس بات کا معتقد ہے کہ ہر سال کی شب قدر میں اس سال کی ضرورت کے مطابق آیات ایک ہی دفعہ اکٹھی نازل ہوجاتیں اور پھر وہی آیات مختلف مناسبتوں اور واقعات کے پیش نظر اس پورے سال میں تدریجاً نازل ہوتی تھیں۔

اس نظریہ کے مطابق کوئی ایک خاص رمضان المبارک یا کوئی ایک خاص شبِ قدر مقصود نہیں ہے بلکہ تمام سالوں کے رمضان المبارک کے مہینے اور شبہای قدر مراد ہیں۔[1]

تیسرا نظریہ: ایک گروہ اس بات کا معتقد ہے کہ قرآن مجید کے دو نزول ہیں:

۱۔ دفعی نزول (یعنی یکجا اور اکٹھا نازل ہونا) ۲۔ تدریجی نزول (یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے بحسب ضرورت نازل ہونا)

شب قدر میں پورا قرآن یکجا طور پر پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوا اور پھر دوبارہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے پورے عرصہ میں تدریجاً نازل ہوتا رہا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد روایات ہیں۔

اہل سنت کی روایات کے مطابق قرآن مجید یکجا طور پر عرش سے پہلے آسمان کے ''بَيْتُ الْعِزَّة'' نامی مقام پر نازل ہوا۔

لیکن شیعہ روایات کے مطابق قرآن مجید عرش سے چوتھے آسمان کے ''بَيْتُ الْمَعْمُوْر'' پر نازل ہوا۔ (یہ بات قرآن کریم کے دفعی نزول کے متعلق ہے)۔ لیکن قرآن کریم کا تدریجی نزول بیس (۲۰) سال کے عرصے میں ہوا۔

قرآن مجید کے دفعی و تدریجی نزول اور مفہوم کے بارے میں بزرگ علماء نے جو مختلف توجیہات پیش کی ہیں ان میں سے کچھ یہاں بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ شبِ قدر میں پیغمبر اکرم ﷺ پر قرآن مجید کے دفعی نزول سے مراد، پیغمبر اکرم ﷺ کو قرآن مجید کے کلی موضوعات اور مجموعی مفاہیم سے آگاہ کرنا ہے۔

اس تاویل کو شیخ صدوقؒ نے یوں بیان کیا ہے: ''یعنی شبِ قدر میں پیغمبر اکرمؐ پر قرآن مجید اپنے ان الفاظ اور عبارات کے ساتھ نازل نہیں ہوا بلکہ صرف اجمالی طور پر اس کے مطالب کی اصل روح سے آپ کو آگاہ کیا گیا ہے۔

۲۔ ابو عبداللہ زنجانی فرماتے ہیں:

قرآن مجید کے اعلیٰ اہداف میں سے ہے کہ کلی مفاہیم پر مشتمل روحِ قرآن شب قدر میں آنحضرت ﷺ کے قلبِ مبارک پر متجلی ہوئی: '' نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ؛ عَلٰى قَلْبِكَ؛ جسے روح امین نے اتارا، آپؐ کے قلب پر'' [2] اور پھر قرآن سالہا سال پیغمبر اکرم ﷺ کی زبان مبارک پر جاری ہوتا رہا۔

۳۔ عظیم مفسر علامہ محمد حسین طباطبائی نے بھی یہی تاویل بڑے لطیف انداز میں بیان کی ہے:

---

۱) تفسیر کبیر؛ ج۵، ص۸۵/ تفسیر الدر المنثور، ج۱، ص۱۸۹/ تفسیر مجمع البیان؛ ج۲ ص۲۷۶/ الاتقان؛ ج۱، ص۴۰

۲) سورۂ شعراء/ آیت ۱۹۴۔ ۱۹۳

بنیادی طور پر قرآن مجید کے اس ظاہری وجود کے پس پردہ ایک دوسری حقیقت اور وجود ہے جسے معمولی طور پر دیکھا اور درک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید کا باطنی وجود ہر طرح کے تجزیہ سے پاک ہے۔ نہ تو اس کے اجزاء ہیں نہ فصلیں اور نہ اس کی آیات ہیں نہ سورتیں۔ وہ اپنے اعلیٰ مقام پر فائز ایک منسجم اور مستحکم حقیقت ہے کہ جو کسی کی بھی دسترس میں نہیں ہے۔

''کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ؛ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں اور ایک صاحب علم وحکمت کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے''۔ [1]

پس قرآن مجید کے دو وجود ہیں: (الف) ظاہری وجود، الفاظ اور عبارات کی صورت میں ہے۔ (ب) باطنی وجود، اپنے اصلی مقام پر فائز ایک مستحکم حقیقت ہے۔

لہٰذا شبِ قدر میں قرآن مجید کا وہی باطنی اور اصلی وجود مکمل طور پر پیغمبر اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر نازل ہوا اور پھر آنحضرتؐ کی نبوت کے پورے عرصے میں مختلف مناسبتوں اور واقعات کے پیش نظر ظاہری اور تفصیلی صورت میں تدریجاً نازل ہوتا رہا۔ [2]

اگر ایسی لطیف اور ظریف تاویلات کی کوئی سند اور دلیل ہو تو پھر یہ بہت مناسب ہیں۔ البتہ یہ تمام نظریات قابلِ بحث ہیں ان میں سے حقیقت کے قریب اور قرآن کریم کے ظاہر کے مطابق وہی پہلا نظریہ ہے جسے شیخ مفید نے بیان کیا ہے یعنی نزولِ قرآن کا آغاز شبِ قدر سے اور رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ میں ہوا۔

سوالات

۱۔ نزولِ قرآن کا آغاز کس رات میں ہوا ہے اور قرآن کریم کے تدریجی نزول میں کیا حکمت ہے؟

۲۔ پیغمبر اکرمؐ پر قرآن کریم کے عنوان سے نازل ہونے والی سب سے پہلی آیت کون سی ہے اور کس سال نازل ہوئی ہے؟

۳۔ نزولِ قرآن کے متعلق ''دورِ فترت'' سے مراد کون سا دور ہے اور اس کا آغاز اور انجام کن آیات سے ہوا ہے؟

۴۔ نزولِ قرآن کا آغاز شبِ قدر سے کیسے ہوا جبکہ ستائیس (۲۷) رجب کو سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے نازل ہوتے ہی پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت کا آغاز ہو گیا تھا؟

۵۔ سورہ حمد کو ''فَاتِحَةُ الْكِتَاب'' کیوں کہا جاتا ہے؟

۶۔ نزولِ قرآن شبِ قدر میں کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ قرآن مجید بیس سال کے عرصہ میں مختلف مناسبتوں اور واقعات کے پیشِ نظر تدریجاً نازل ہوا۔ اس بارے میں تینوں نظریات بیان کریں؟

۷۔ قرآن کریم کے دفعی اور تدریجی نزول پر شیخ صدوق نظریہ بیان کریں؟

---

[1] سورہ ہود/آیت ۱

[2] تفسیر المیزان؛ ج ۱ص ۱۵

چوتھا سبق

اسبابِ نزول

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید زمانہ بعثت میں مختلف مناسبتوں سے تدریجاً نازل ہوا۔ کسی اہم واقعہ کے رونما ہونے پر یا کسی مشکل سے دوچار ہونے پر یا رسول پاک ﷺ سے پوچھے جانے والے کسی سوال کے جواب میں حسبِ ضرورت ایک آیت یا چند آیتیں اور کبھی ایک سورۃ نازل ہوجاتی۔ ان درپیش حالات وکیفیات کو"اسباب نزول" یا "شان نزول" کہا جاتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ موقع اور مناسبت سے نازل ہونے والی آیت اس خاص واقعہ اور مناسبت ہی کے بارے میں ہوا کرتی تھی۔ پس اگر اس آیت کے لفظ یا معنیٰ میں کوئی ابہام یا مشکل پیش آئے تو اس واقعہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہر آیت کا مکمل معنیٰ و تفسیر جاننے کیلئے شانِ نزول کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

مثال کے طور پر، آیت: "اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا؛ صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کیلئے ان دونوں کے طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے"۔ [1] اس آیت کے بارے میں یہ اعتراض ہوا کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا حج و عمرہ کے واجب ارکان میں سے ہے تو پھر اسے لفظ "لَا جُنَاحَ" سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟

اس آیت کا ظاہری معنیٰ یہ ہے: ان دو پہاڑیوں "صفا و مروہ" کے درمیان سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس عبارت سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کا جائز ہونا سمجھا جاتا ہے نہ واجب ہونا۔ لیکن شانِ نزول کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ عبارت گناہ کے وہم و گمان کو دور کرنے کیلئے لائی گئی ہے۔ ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ طے پایا کہ پیغمبر اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ عمرہ کی رسومات ادا کرنے کے لیے آئندہ سال مکہ مکرمہ مشرف ہوں۔ اس قرارداد میں یہ بھی طے ہوا کہ مشرکینِ مکہ تین دن اپنے بتوں کو خانہ کعبہ اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں سے ہٹالیں گے تاکہ مسلمان طوافِ کعبہ اور صفا و مروہ کی سعی والی دینی رسومات آزادانہ انجام دے سکیں۔ تین دن گذرنے کے بعد مشرکینِ مکہ نے دوبارہ اپنے بتوں کو لاکر خانہ کعبہ اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر رکھ دیا۔ لیکن ابھی تک کچھ مسلمان بعض وجوہات کی بنا پر صفا و مروہ میں سعی انجام نہیں دے سکے تھے اور صفا و مروہ پر

۱) سورۂ بقرہ/آیت ۱۵۸

بتوں کی موجودگی سے ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اب سعی کرنا گناہ ہے۔ ایسے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی تا کہ مسلمان صفا ومروہ کے درمیان سعی ترک نہ کریں۔ کیونکہ سعی کرنا شعائر اللہ میں سے ہے اور بتوں کا وجود ایک عارضی چیز ہے جو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔[1]

لہذا اس آیت کے شانِ نزول کی طرف رجوع کرنے سے اس کا معنیٰ و مفہوم مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ درحقیقت یہ صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے کے جائز یا واجب ہونے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فقط اس کے ممنوع ہونے کے خیال کی نفی ہے یعنی بتوں کی موجودگی کے باوجود سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

سببِ نزول یا شانِ نزول

ان دو تعبیروں میں کیا فرق ہے؟ اکثر مفسرین کی نگاہ میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ انہوں نے کسی ایک آیت یا چند آیتوں کے نازل ہونے کا باعث بننے والی مناسبت کو کبھی ''سببِ نزول'' اور کبھی ''شانِ نزول'' کہا ہے۔ حالانکہ ان دو تعبیروں میں بہت فرق ہے۔ کیونکہ شانِ نزول، کا دائرہ سببِ نزول کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ جب بھی کسی موقع ومحل کی مناسبت سے کسی شخص کے بارے میں یا ماضی، حال مستقبل کے کسی اور واقع احکام کے فرض ہونے پر ایک یا چند آیتیں نازل ہوں تو ان سب واقعات کو آیات کا ''شانِ نزول'' کہتے ہیں۔ بطور مثال کہا جاتا ہے کہ فلاں آیت عصمتِ انبیاء یا فرشتوں کی عصمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن ''سببِ نزول'' ایسا واقعہ یا حادثہ جس کے بعد ایک آیت یا چند آیتیں نازل ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ واقعہ یا حادثہ ان آیات کے نازل ہونے کا باعث بنا ہو، اسی وجہ سے سببِ نزول کا دائرہ تنگ اور شانِ نزول کا عام ہے۔

تنزیل اور تاویل

قرآنی علوم کے ماہرین کی اصطلاح میں لفظ "تنزیل" "نزولِ قرآن" کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ شان نزول کوئی ایک خاص واقعہ ہوسکتا ہے جو آیت کے نازل ہونے کا سبب بنا ہو۔ لیکن "تأویل" ایک ایسا عام مفہوم ہے جسے آیت سے سمجھا جاسکتا ہے اور اسے دوسرے مشابہ واقعات پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ بعض تعبیروں میں ان دونوں کو ''ظاہر اور باطن'' کہا گیا ہے ظاہر یعنی تنزیل اور باطن یعنی تاویل۔ کیونکہ آیت کے ظاہر سے وہی موردِ نزول سمجھا جاتا ہے اور آیت کے باطن میں ایک وسیع مفہوم پایا جاتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی مشہور حدیث: ''مَا فِی الْقُرآنِ آیَۃٌ اِلَّا وَلَھَا ظَھر وَ بَطن؛ قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس کا ظاہر اور باطن نہ ہو'' کے متعلق فضیل بن یسار نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

ظاہر سے مراد شان نزول اور باطن سے مراد اس آیت کی تاویل ہے جس کے کچھ موارد ماضی میں گزر چکے اور کچھ ابھی باقی

1) تفسیر عیاشی؛ ج۱، ص۷۰

ہیں۔قرآن مجید ہمیشہ اور ہر وقت زندہ وجاوید، قابلِ استفادہ ہے اور سورج وچاند کی مانند حرکت میں ہے۔ [۱]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ظهر القرآن الذين نزل فيهم و بطنه الذين عملوا بمثلِ أعمالهم؛ ''ظاہر قرآن'' جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے اور ''باطن قرآن'' جن کے اعمال اور کردار ان لوگوں کی مانند ہو کہ جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے''۔ [۲]

فقہاء اور اسلامی دانشوروں نے آیات کے سبب وشانِ نزول اور تنزیل وتاویل سے ایک قانون وضع کیا ہے اور اسی قانون کے ذریعہ مختلف احکام پر فتویٰ دیتے ہیں۔قانون یہ ہے: ''العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص المورد؛ لفظ کی وسعت اور گستردگی معتبر ہے نہ کہ اس کا خاص مورد اور مصداق''۔یعنی ایک دانا فقیہ کو چاہیے کہ وہ آیت کے اس مورد اور مصداق میں پائی جانے والی خصوصیات کو چھوڑ کر لفظ کے عمومی پہلوؤں سے استفادہ کرے۔اگرچہ سبب نزول کلام کی دلالت اور مقصود کو سمجھنے میں مفید ہے لیکن اسی میں منحصر نہیں کیونکہ الٰہی احکام ہمیشہ سب کیلئے ہیں اور تمام زمانوں پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسبابِ نزول تک رسائی

اسباب نزول تک رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے پہلے بزرگوں نے کوئی قابل اعتناء اور مفید مطالب تحریری طور پر محفوظ نہیں کیے۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قدماء حالات سے مکمل آگاہ تھے اور آئندہ نسلوں کیلئے اپنی معلومات اور شواہد کو بطورِ سند مکتوب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔خود تو اس بارے میں بعد میں متعدد روایات خاص اہداف کے تحت بیان ہوئی ہیں جن میں سے اکثر روایات کی سند ضعیف اور نا قابل اعتماد ہے۔بالخصوص بنی امیہ کے تاریک دور حکومت میں متعدد آیات کی تفسیر جعلی شان نزول کے ذریعے اور مَن پسند تاویل سے کی گئی ہے۔

واحدی نیشاپوری اپنی کتاب ''اسباب النزول'' میں لکھتے ہیں:

آیات کے اسبابِ نزول کے بارے میں کچھ کہنا جائز نہیں مگر یہ کہ کوئی صحیح اور قابلِ اعتماد روایت موجود ہو اور یہ روایت ان افراد سے نقل ہو جو خود اس زمانہ میں رونما ہونے والے واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں نہ یہ کہ انہوں نے اپنے وہم وگمان، بے بنیاد اور سنی سنائی باتوں کی وجہ سے اسے بیان کیا ہو۔

پھر وہ ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''حدیث کو نقل اور روایت کرنے سے پرہیز کرو مگر یہ کہ تمہیں اس کے متعلق صحیح شناخت اور علم حاصل ہو۔کیونکہ جس کسی نے بھی کوئی جھوٹی بات قرآن اور میری طرف منسوب کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

۱) بصائر الدرجات، ص۱۹۶، حدیث ۷

۲) تفسیر عیاشی؛ ج۱، ص۱۱، حدیث ۴

محمد ابن سیرین کہتے ہیں:

میں نے ایک مشہور تابعی عبیدۃ سے ایک آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا: وہ لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے جنہیں یہ معلوم تھا کہ قرآن مجید کہاں اور کس طرح نازل ہوا ہے۔

واحدی نیشاپوری کہتے ہیں:

اس زمانہ میں بہت سے لوگوں نے شان نزول کے بارے میں حد سے زیادہ دروغ گوئی کی ہے لہذا قرآن مجید کے حقایق تک رسائی کیلئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔[1]

جلال الدین سیوطی اس موضوع میں بڑی مہارت رکھنے کے باوجود بھی دو سو پچاس سے زیادہ (غلط اور صحیح سے قطع نظر) مسند احادیث جمع نہیں کر سکے۔[2] لیکن خوش قسمتی سے اہلِ بیت علیہم السلام کے مذہب میں بہت سی صحیح روایات خود انہی کے واسطہ سے ہم تک پہنچی ہیں اور اب تک چار ہزار سے زیادہ روایاتِ شان نزول پر جمع کی جا چکی ہیں۔

اسبابِ نزول تک رسائی کیلئے جن موجودہ منابع سے استفادہ کیا جاتا ہے وہ ایک حد تک ہی قابلِ اطمینان ہیں۔ مثال کے طور پر؛ جامع البیان؛ طبری، الدر المنثور؛ سیوطی، مجمع البیان؛ طبرسی، التبیان؛ طوسی اور ان کے علاوہ خاص طور پر اسبابِ نزول کے موضوع پر لکھی گئی بعض دوسری کتابیں جیسے اسباب النزول؛ واحدی نیشاپوری؛ اور لباب النقول؛ جلال الدین سیوطی وغیرہ ہیں۔ البتہ ان کتابوں میں صحیح و غلط روایات سب مخلوط ہیں جن کی تشخیص کیلئے گہری نظر کی ضرورت ہے بالخصوص ان کے آپس میں ٹکراؤ کی صورت میں درج ذیل طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعے ممکن ہے۔

۱۔ سندِ حدیث، خاص طور پر آخری فرد کا موردِ اطمینان اور باوثوق ہونا ضروری ہے کہ جس پر روایت کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، یعنی وہ آخری فرد معصوم ہو یا قابلِ اطمینان صحابی ہو جیسے عبداللہ بن مسعودؓ، أبیّ بن کعبؓ اور ابن عباسؓ (جو قرآنی امور میں مہارت رکھتے تھے اور امت کے نزدیک قابلِ قبول بھی ہیں) یا قابل قدر تابعی ہو جیسے مجاہد، سعید بن جبیر، سعید بن مسیب جو اپنی طرف سے کچھ نہیں گھڑتے تھے اور ان میں دروغ گوئی بھی نہیں پائی جاتی تھی۔

۲۔ روایات کا متواتر یا مستفیض (کثرت سے نقل ہونا) ثابت ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ روایت کے الفاظ و عبارتیں مختلف بھی ہوں لیکن ان کا مضمون ایک ہونا چاہیے اور اگر وہ روایات مضمون میں اختلاف پائے جانے کے باوجود بھی آپس میں قابلِ جمع ہوں تو اس صورت میں مذکورہ روایت و خبر کے صحیح ہونے کے بارے میں اطمینان ہو جائے گا۔

۳۔ اسبابِ نزول بیان کرنے والی روایات اگر آیت پر اٹھنے والے سوال کا حتمی جواب دیں اور ابہام دور کریں تو یہ خود اس روایت اور خبر کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ اگرچہ علم حدیث کی اصطلاح میں وہ روایت صحیح نہ بھی ہو۔

---

۱) اسباب النزول؛ ص ۴

۲) [illegible]

سوالات

۱۔اسبابِ نزول کی تعریف کرتے ہوئے یہ بیان کریں کہ ان کے جاننے کا فائدہ کیا ہے؟

۲۔آیت ''اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا'' کا شانِ نزول لکھیں اور یہ بتائیں کہ لفظِ ''لَا جُنَاحَ'' کس اہم نکتے کو بیان کر رہا ہے؟

۳۔شانِ نزول اور اسبابِ نزول میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟

۴۔تنزیل اور تاویل کی تعریف کریں اور ان کا دوسرا نام بھی لکھیں؟

۵۔اسبابِ نزول کی پہچان آسان کیوں نہیں ہے؟

۶۔اسبابِ نزول کی پہچان کے متعلق لکھی گئی چند قابلِ اعتماد کتابوں کے نام لکھیں؟

۷۔اسبابِ نزول سے متعلق روایات کے صحیح یا غلط ہونے کو کن طریقوں سے پہچانا جا سکتا ہے؟

پانچواں سبق

کاتبین وحی

پیغمبر اکرم ﷺ ظاہری طور پر پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے تھے اور اپنی قوم کے درمیان بھی پڑھے لکھے فرد ہونے کے عنوان سے بھی مشہور نہیں تھے۔ کیونکہ کسی نے بھی آپؐ کو کبھی پڑھتے یا لکھتے نہیں دیکھا تھا اسی وجہ سے آپؐ کو ''اُمّی'' کہا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں خداوند متعال نے بھی آپؐ کو اسی صفت کے ساتھ یاد کیا ہے ''...فَآمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ''۔ [۱]

اُمّی کے معنیٰ

أُمّي کی نسبت اُمّ (ماں) سے ہے اور أُمّي اسے کہتے ہیں جو جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے ویسے ہی ہو یعنی اس نے تعلیم حاصل نہ کی ہو۔

اس لفظ ''أُمّي'' کا ایک دوسرا معنی بھی کیا گیا ہے کہ أُمّي، اُمّ القریٰ (شہرِ مکہ) سے منسوب ہے۔ یعنی اُمّي اسے کہتے ہیں جو شہر مکہ میں پیدا ہو۔ قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات پر بھی اس لفظ (أمّي) کے بعض مشتقات ذکر ہوئے ہیں؛ مثال کے طور پر ''هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِنْهُمْ...'' [۲] شاید اس آیت میں لفظ أُمّيين سے مراد، اہلِ مکہ ہوں۔ لیکن پہلا نظریہ مشہور ہے اور قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی زیادہ مطابقت رکھتا ہے اولاً: ''وَ مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ'' [۳] اس آیت میں جملہ ''لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ'' ظاہراً ''أُمّيون'' کی تفسیر ہے۔ ثانیاً: قرآن کے معجزہ ہونے پر جو بات دلیل بنتی ہے وہ آپ ﷺ کا نہ لکھنا اور نہ پڑھنا ہے ایسا نہیں کہ آپ استعداد نہ رکھتے تھے۔

''وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَ لَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ؛ اور اے پیغمبر آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے ورنہ یہ اہلِ باطل ضرور شبہ میں پڑ جاتے''۔ [۴]

---

۱) سورۂ اعراف/آیت ۱۵۸۔۱۵۷

۲) سورۂ جمعہ/آیت ۲

۳) سورۂ بقرہ/آیت ۷۸

۴) سورۂ عنکبوت/آیت ۴۸

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر اکرم نہ کچھ پڑھتے تھے اور نہ ہی کچھ لکھتے تھے لیکن ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ بالکل پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے تھے۔ دشمنوں کو چپ کرانے کیلئے بس اتنا کافی ہے۔ کیونکہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ کو ہرگز تعلیم یافتہ نہیں سمجھتے تھے اسی وجہ سے اعتراض نہیں کرپاتے تھے۔

شیخ طوسیؒ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

مفسرین نے کہا ہے: ''پیغمبر اکرم ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے'' لیکن آیت اس مطلب کو بیان نہیں کرتی۔ بلکہ آیت صرف اس پہلو کو بیان کررہی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ لکھتے اور پڑھتے نہیں تھے۔ کتنے ایسے افراد ہیں جو نہیں لکھتے لیکن لکھنا جانتے ہیں اور ظاہری طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اَن پڑھ ہیں اور لکھنا نہیں جانتے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ لکھتے اور پڑھتے نہیں تھے اور انہیں لکھنے کی عادت نہیں تھی۔ [1]

عظیم مفسر قرآن علامہ محمد حسین طباطبائیؒ نے بھی اسی نظریے کو اپناتے ہوئے فرمایا ہے: علم، کمال ہے اور جہالت، نقص وعیب ہے اور کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے تمام کمالات خداوند متعال کی خاص عنایت کے طفیل تھے اور آپ ﷺ نے کبھی کسی استاد سے تعلیم حاصل نہیں کی پس یہ نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس اس کمال سے محروم ہو۔ [2]

لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کے عدم اظہار کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو مختلف مواقع پر کاتبین کی ضرورت پڑی جو آپؐ کیلئے کتابت کریں۔ لہٰذا آپؐ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں شہروں میں سب سے بہترین اور تعلیم یافتہ افراد کو کتابت کیلئے منتخب کیا۔ سب سے پہلے جس نے مکہ میں کتابت، خاص طور پر وحی کی کتابت کی ذمہ داری سنبھالی اور پیغمبر اکرم کی حیات طیبہ کے آخری دن تک اس ذمہ داری کو ادا کیا وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا بھی اس بات پر بہت اصرار تھا کہ جو کچھ بھی نازل ہو حضرت علی علیہ السلام اسے لکھیں اور محفوظ کریں تاکہ قرآن اور آسمانی وحی میں سے کوئی چیز بھی علی علیہ السلام کی دسترس سے باہر نہ رہے۔

تابعین میں سے سلیم بن قیس ہلالی کہتے ہیں:

میں مسجد کوفہ میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا جب کہ لوگ آپؑ کے گرد جمع تھے اس وقت آپؑ نے فرمایا: جب تک میں تمہارے درمیان ہوں کتابِ الٰہی (قرآن مجید) کے بارے میں مجھ سے سوال کرنے میں جھجک نہ کرو۔ خدا کی قسم! کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ پیغمبر اکرم ﷺ مجھے بتلاتے اور اس کی تفسیر وتاویل سکھاتے۔

حضرت علی علیہ السلام کے ایک صحابی عبداللہ بن عمرو یشکری المعروف ابن الکوّاء نے آپؑ سے سوال کیا: یہ بتلائیے کہ جب آپؑ پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس تشریف فرما نہیں ہوتے تھے اور کچھ نازل ہوتا تو اس کا کیا بنتا تھا؟

---

۱) تفسیر التبیان: ج۸، ص ۱۹۳

۲) تفسیر المیزان: ج۱۶، ص ۱۴۵

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جب میں پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے:

'اے علی! آپ کی عدم موجودگی میں کچھ آیتیں نازل ہوئی ہیں تب آپ ان (آیتوں) کو میرے لیے تلاوت فرماتے اور ان کی تفسیر و تاویل بھی مجھے سکھاتے۔[۱]

مدینہ منورہ میں سب سے پہلے ''اُبیّ بن کعب انصاری'' نے وحی کی کتابت کا عہدہ سنبھالا، جو زمانہ جاہلیت سے لکھنا جانتے تھے۔ اُبیّ ابن کعب انصاری کو پیغمبر اکرم ﷺ کنے پورا قرآن کریم پیش کیا۔ عہدِ عثمان میں ''اتحادِ مصاحف'' گروہ کے سرپرست بھی یہی تھے اور جب بھی کسی مورد میں اختلافِ نظر ہوتا تو اُبیّ ابن کعب کی رائے سے وہ مشکل حل ہو جاتی تھی۔[۲]

مدینہ منورہ میں ''زید بن ثابت'' پیغمبر اکرم کے ہمسائے تھے اور لکھنا بھی جانتے تھے۔ شروع میں جب پیغمبر اکرم کو کچھ لکھنا ہوتا اور اُبیّ ابن کعب بھی موجود نہ ہوتے تو آپ زید بن ثابت کو لکھنے کیلئے بلوا لیتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ زید بن ثابت کی کتابت بھی رسمی ہوگئی۔ یہاں تک کہ اس نے پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم پر عبرانی زبان لکھنا اور بولنا سیکھی تا کہ عبرانی خطوط پیغمبر اکرم ﷺ کیلئے پڑھیں اور ان کا جواب لکھیں۔ زید بن ثابت نے دوسرے اصحاب کی نسبت لکھنے میں پیغمبر اکرم ﷺ کی زیادہ ہمراہی کی ہے اور اکثر خط و کتابت کیا کرتے تھے۔[۳]

اسی بنا پر سب سے بہترین کاتبینِ وحی، حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام، اُبیّ بن کعب اور زید بن ثابت تھے جبکہ باقی کاتبینِ وحی دوسرے درجے پر تھے۔

ابن اثیر کہتے ہیں:

ہمیشہ کتابت کرنے والوں میں سے ایک عبداللہ بن ارقم زہری تھے جن کی ذمہ داری پیغمبر اکرم ﷺ کے خطوط لکھنا تھی۔ لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کے معاہدوں اور صلح ناموں کے ذمہ دار حضرت علی علیہ السلام تھے۔

ابن اثیر مزید کہتے ہیں:

وہ کاتبین جو کبھی کبھار پیغمبر اکرم ﷺ کیلئے کتابت کیا کرتے تھے اُن میں خلفائے ثلاثہ، زید بن عوام، سعید بن عاص کے دو بیٹے خالد اور اُبان، حنظلہ بن اُسیدی، علاء بن حضرمی، خالد بن ولید، عبداللہ بن رواحہ، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن ابی سلول، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن عاص، معاویہ بن ابی سفیان، جہم یا جہیم بن صلت، معیقب بن ابی فاطمہ اور شرحبیل بن حسنہ تھے۔

ظاہراً اِن افراد کا شمار اُس زمانہ میں عرب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا تھا جو پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے اور ضرورت پیش آنے پر حضور ﷺ کبھی کبھار اُن سے کتابت کا کام لیتے تھے۔ لیکن رسمی کاتبین مذکورہ تین افراد (علی ابن ابی طالبؑ، اُبیّ بن کعبؓ،

---

۱) السقیفہ؛ ص ۲۱۴۔۲۱۳

۲) التمہید؛ ج ۱، ص ۳۴۸۔۳۴۰

۳) مصاحف سجستانی؛ ص ۳

زید بن ثابتؓ) اور عبداللہ بن ارقمؓ تھے۔ابوعبداللہ زنجانی نے چالیس سے بھی زیادہ افراد کو کاتبینِ وحی میں سے شمار کیا ہے کہ ظاہراً بوقتِ ضرورت ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔[1]

رسالتمآب ﷺ کے زمانے میں کتابت کا طریقہ کار یہ تھا کہ ہر اس چیز پر لکھا کرتے تھے جو میسر ہوتی اور جس پر لکھنا بھی ممکن ہوتا تھا، مثال کے طور پر:

۱۔عُسُب (عَسیب کی جمع) کھجور کے درخت کی ٹہنی، کھجور کے درخت کی ٹہنیوں کے درمیان والی لکڑی جس کے پتوں کو الگ کر کے اس کے چوڑے حصہ پر لکھتے تھے۔

۲۔لِخاف (لخفة کی جمع) باریک اور سفید پتھر۔

۳۔رِقاع (رقعة کی جمع) کھال کے ٹکڑے، پتے یا کاغذ۔

۴۔اُدُم (ادیم کی جمع) ایسی کھال کہ جسے لکھنے کیلئے تیار کیا گیا ہو وغیرہ۔

قرآن کریم کی آیات لکھنے کے بعد، نگہداری کے لیے پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس ان کے گھر میں محفوظ کر دی جاتی تھیں۔بعض اوقات جب صحابہ کرامؓ کسی ایک یا چند سورتوں کو اپنے پاس بطورِ تبرّک رکھنا چاہتے تو انہیں پتوں یا کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھ لیتے اور غالباً انہیں کپڑے کے تھیلوں میں ڈال کر دیوار پر لٹکا دیتے تھے۔[2]

ہر سورہ میں آیات مرتّب انداز میں اور منظم طور پر لکھی جاتی تھیں۔ہر سورہ کا آغاز بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کے نزول سے ہوتا اور دوسری نئی بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کے نزول سے پہلی سورہ مکمل ہو جاتی۔یوں سب سورتیں مستقل اور الگ الگ لکھی جاتی تھیں۔البتہ عہدِ رسالتمآب ﷺ میں سورتیں منظم اور مرتب نہیں تھیں تمام سورتیں علیحدہ طور پر محفوظ تھیں۔

سوالات

۱۔"اُمّی" سے کیا مراد ہے؟ کیا پیغمبر اکرم کا اُمّی ہونا، آپؐ کے پڑھنے اور لکھنے میں ناتوانی کی دلیل ہے؟

۲۔پہلے درجے کے کاتبینِ وحی کے نام بیان کریں؟

۳۔مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں سب سے پہلے کاتبِ وحی کے نام لکھیں؟

۴۔عہدِ رسالتمآبؐ میں کتابت کا طریقہ کار کیا تھا اور کن چیزوں پر لکھا جاتا تھا؟

۵۔قرآن کریم کی آیات کے نازل ہونے کے بعد اُن کی حفاظت کس کے ہاں ہوا کرتی تھی؟

---

۱) تاریخ القرآن، ص ۲۱۔۲۰

۲) التمہید؛ ج ۱، ص ۲۸۸

چھٹا سبق

مکی اور مدنی سورتیں

مکی و مدنی سورتوں کی شناخت کا مسئلہ قرآنی علوم کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ مکہ مکرمہ میں پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی سورتیں ''مکی'' اور مدینہ منورہ میں پیغمبر اکرم پر نازل ہونے والی سورتیں ''مدنی'' کہلاتی ہیں۔

مکی اور مدنی سورتوں کی پہچان درج ذیل دلائل کی بنا پر ضروری ہے:

۱۔ تاریخِ اسلام اور اسلامی قوانین کے ایک حصے کی پہچان، آیتوں اور سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کی شناخت سے مربوط ہے۔

۲۔ آیت کے مضمون کا سمجھنا فقہی استدلالات اور فتاویٰ میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی کوئی آیت ظاہری طور پر کسی شرعی حکم پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن کیونکہ وہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس کے نزول کے وقت ابھی وہ حکم تشریع نہیں ہوا تھا لہذا یا تو اس آیت کی تاویل کی جائے یا کسی اور طرح سے تفسیر کی جانی چاہیے۔ مثال کے طور پر، فقہاء کے درمیان یہ مسئلہ مورد بحث ہے کہ کیا کفار فروعِ دین اور شرعی احکام انجام دینے پر شرعی طور پر ذمہ دار ہیں؟ اکثر فقہاء انہیں حالت کفر میں فروعِ دین اور شرعی احکام کی انجام دہی پر شرعاً ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ اس بارے ان کے پاس بہت سی اُدلہ اور روایات ہیں۔ لیکن ان کا مخالف گروہ جو کفار کو حالتِ کفر میں فروعِ دین اور شرعی احکام کی انجام دہی پر شرعاً ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ انہوں نے سورہ فصّلت کی ساتویں آیت کو دلیل بنایا ہے، جس میں فریضہ زکات ادا نہ کرنے کی وجہ سے مشرکین کی ملامت ہوئی ہے۔ وہ اس بات سے غافل رہے کہ سورہ فصّلت مکی ہے جبکہ زکات مدینہ میں واجب ہوئی ہے یعنی اس مذکورہ آیت کے نزول کے وقت ابھی تک زکات مسلمانوں پر بھی واجب نہ تھی تو پھر مشرکین کو موردِ مذمت کیسے قرار دے سکتی ہے؟ اس آیت کی دو تاویلیں ہیں:

الف: اس آیت میں ''زکات'' سے مراد صرف صدقات کی ادائیگی ہے کہ جس سے مشرکین محروم تھے۔ چونکہ صدقات کے صحیح ہونے کی شرط، قصدِ قربت (قُربۃً اِلَی اللہ) ہے اور اس کی انجام دہی پر کفار قاصر ہیں۔

ب: اس سے مراد ان (کفار) کا زکات ادا کرنے سے محروم ہونا ہے۔ کیونکہ خود اُن کا کفر اس بات میں رکاوٹ بنا ہے اور اگر وہ صاحبِ ایمان ہوتے تو اس فیض سے محروم نہ ہوتے۔[۱]

---

۱) تفسیر مجمع البیان؛ ج ۹، ص ۵ ؛ تفسیر المیزان؛ ج ۱۷، ص ۳۸۴

۳۔ کلامی استدلالات میں دلیل قرار پانے والی اکثر آیات مدنی ہیں بالخصوص وہ آیات جو اہلِ بیت علیہم السلام کے فضائل اوران کی شان میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ یہ باتیں مدینہ میں زیر بحث تھیں۔ بعض نے ان سورتوں اور آیات کو مکی شمار کیا ہے اس طرح انہیں فضائل کے لیے دلیل نہیں بنایا۔ اسی لیے سورتوں اور آیات کے مکی اور مدنی ہونے کی کامل شناخت علم کلام میں ''بحثِ امامت'' کی ضروریات میں سے ہے۔ مثال کے طور پر ان آیات کو ملاحظہ فرمائیں: ''وَ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ؛ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ؛ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ؛ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ؛ وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا''۔ [1]

ان آیات کے شانِ نزول کے متعلق کہا گیا ہے کہ: حسنین علیہما السلام بیمار ہوئے تو پیغمبر اکرم ﷺ اور عرب کے شرفاء ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ اگر آپ اپنے بچوں کی شفایابی کیلئے نذر کریں (منّت مانیں) تو خداوند متعال انہیں بہت جلد شفا عطا فرمائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام نے بھی ان کا مشورہ مانتے ہوئے تین دن روزہ رکھنے کی نذر کرلی۔ جب حسنین علیہما السلام شفایاب ہوگئے تو حضرت علی علیہ السلام نے وہ نذر پوری کرنے کی خاطر روزہ رکھا اور افطاری کیلئے کچھ روٹیاں مہیا کیں۔ پہلے دن افطاری کے وقت ایک مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور مدد کا سوال کیا تو حضرت علی علیہ السلام نے وہ تیار شدہ روٹیاں اسے دے دیں۔ دوسرے دن یتیم آیا اور افطاری کے لئے پکی ہوئی روٹیاں لے گیا۔ تیسرے دن ایک اسیر سوالی بن کر آیا اور روٹیاں اسے دے دی گئیں۔ خود حضرت علیؑ نے تینوں دن تھوڑی سی سوکھی روٹی اور کچھ پانی کے ساتھ روزے افطار کیے۔

صاحبِ تفسیر ''مجمع البیان'' علامہ طبرسیؒ نے اِس بارے میں فریقین سے متعدد روایات کی جمع آوری کی ہے اور انہیں مفسرین کے نزدیک تقریباً موردِ اتفاق قرار دیا ہے۔ اُس کے بعد اِس پوری سورہ کے مدنی ہونے کے بارے میں ترتیبِ نزول کی روایات کو معتبر اسناد کے ساتھ بیان کی ہیں۔ [2]

البتہ عبداللہ بن زبیر جیسے افراد جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ فضیلت اہل بیت علیہم السلام سے مختص ہو اُن کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ سورہ انسان (دہر) کو مکی کہیں جبکہ اس بات سے غافل رہے کہ مکہ مکرمہ میں تو کوئی اسیر ہی نہیں تھا۔ [3]

۴۔ اکثر قرآنی مسائل، سورتوں یا آیات کے فقط مکی یا مدنی ہونے سے ہی حل ہوتے ہیں مثال کے طور پر ''نسخِ قرآن'' کے مسئلہ میں آیت ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ''۔ [4] جوازِ دواجِ مؤقت (متعہ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے بعض اسے منسوخ جانتے ہیں اور آیت: ''وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ؛ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ

---

۱) سورۂ انسان، آیت ۱۲-۷

۲) تفسیر مجمع البیان؛ ج ۱۰، ص ۴۰۶-۴۰۴، شواہد التنزیل؛ ص ۳۱۵-۲۲۹

۳) تفسیر الدر المنثور؛ ج ۶، ص ۲۹۷

۴) سورۂ نساء، آیت ۲۴

مَلُوْمِيْنَ: فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ"۔ [۱] کواُس مذکورہ آیت کا ناسخ شمار کیا ہے۔

یہ نظریہ چند اُدلہ کی بنا پر نا قابل قبول ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ سورہ مؤمنون کی مذکورہ آیت کو انہوں نے ناسخ شمار کیا ہے حالانکہ سورہ مؤمنون مکمل طور پر مکی ہے اور کسی نے بھی اِس آیت کو اُس سورہ سے استثناء نہیں کیا اور سورہ نساء کی آیت مدنی ہے۔ جبکہ طبقِ معمول ناسخ آیت کو منسوخ آیت کے بعد ہونا چاہیے۔

مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کا معیار

ترتیب نزول کی روایات سے حاصل شدہ نتائج کے مطابق ۸۶ سورتیں مکی اور ۲۸ سورتیں مدنی ہیں۔

یہ تقسیم درج ذیل تین معیاروں کی بنا پر ہے۔

۱۔زمانی معیار

اکثر مفسرین معتقد ہیں کہ مکی یا مدنی ہونے کا معیار پیغمبر اکرم ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت ہے۔ ہر وہ سورہ جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی، وہ ''مکی'' اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ''مدنی'' ہے، چاہے مدینہ میں نازل ہوئی ہو، یا سفر میں، چاہے دوران حج یا عمرہ کے سفر میں یا فتح مکہ کے بعد مکہ میں نازل ہوئی ہو۔ چونکہ یہ سب ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں تو مدنی شمار ہوں گی۔ کیونکہ ہجرت کا معیار مدینہ میں داخل ہونا ہے لہٰذا وہ آیات جو پیغمبر اکرم ﷺ پر ہجرت مکہ کے بعد اور مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے نازل ہوئیں وہ مکی شمار ہوں گی۔

۲۔مکانی معیار

جو کچھ مکہ اور اس کے نواح میں نازل ہوا وہ ''مکی'' ہے اور جو کچھ مدینہ اور اس کے نواح میں نازل ہوا وہ ''مدنی'' ہے چاہے ہجرت مکہ سے پہلے نازل ہوا یا اس کے بعد۔ پس جو ان دو علاقوں (مکہ و مدینہ) کے علاوہ کسی اور جگہ نازل ہوا وہ نہ مکی ہے نہ مدنی۔

۳۔خطابی معیار

ہر وہ سورہ جس میں خطاب مشرکین سے ہے وہ ''مکی'' اور ہر وہ سورہ جس میں خطاب مومنین سے ہے وہ ''مدنی'' ہے۔ کیونکہ مکہ میں مشرکوں اور مدینہ میں مومنوں کی اکثریت تھی۔

اکثر مفسرین نے ان مذکورہ تین معیاروں میں سے ''زمانی معیار'' کو اپنایا ہے۔

---

[۱] سورۂ مومنون/آیت ۷۔۵

مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کے طریقے

مکی اور مدنی سورتوں کی تشخیص کے لیے بہت سے معیار معین کیے گئے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک معیار بھی مکمل طور پر جامعیت کا حامل نہیں ہے بلکہ یہ سب معیار و ملاک ایک ساتھ مل کر کسی حد تک راہ گشا ہیں۔

مجموعی طور پر مکی و مدنی سورتوں کی تشخیص کے لیے درج ذیل تین معیار ہیں:

۱۔نص وخبر

۲۔صوری اور ظاہری علامات

۳۔نفس مضمون اور روحِ مطلب

یہ بات مدنظر رہے کہ کہیں سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کا معیار اور ان کی شناخت کا ملاک آپس میں خلط نہ ہونے پائے۔اب اس بارے میں مختلف علماء کے نظریات بیان کرتے ہیں۔

علامہ برھان الدین ابراہیم بن عمر بن ابراہیم جعبری (متوفی ۷۳۲) کہتے ہیں:

مکی و مدنی کی شناخت کے دو طریقے ہیں۔

۱: سماعی: یہ طریقہ روایت وخبر کے نقل بیان پر مشتمل ہے۔

۲: قیاسی: یہ طریقہ قاعدہ وقانون کا حامل ہے۔

عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں:

ہر وہ سورہ ''مکی'' ہے جس میں ''یا ایھا الناس '' یا ''کلا'' استعمال ہوا ہے یا اس کے شروع میں حروفِ مقطعہ ہوں (سوائے سورہ بقرہ، سورہ آلِ عمران، اور سورہ رعد کے جو ایک قول کی بنا پر مدنی ہیں) یا اس میں حضرت آدمؑ اور ابلیس کا قصہ ذکر ہوا ہو (بڑی سورتوں کے علاوہ) یا وہ سورہ کہ جس میں گذشتہ انبیاء اور امتوں کے حالات بیان کیے گئے ہوں اور ہر وہ سورہ ''مدنی'' ہے جس میں ''یا ایھا الذین آمنوا'' استعمال ہوا ہے یا جن میں واجبات اور فرائض اور احکام اور حدودِ شرعی بیان ہوئے ہیں۔[۱]

مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کے لیے بعض دوسری خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔عام طور پر کسی سورہ کی آیات کا چھوٹا ہونا یا خود کسی سورہ کا چھوٹا ہونا اس کے مکی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔اسی طرح کسی سورہ میں آیات کا طویل ہونا یا خود کسی سورہ کا طویل ہونا اس کے مدنی ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

۲۔سورہ کا شدید اور سخت لہجہ والا انداز اہل مکہ سے ہے کیونکہ وہ ضدی تھے اور حق کے مقابلہ میں ہٹ دھرمی کیا کرتے تھے کسی سورہ کا نرم اور ملایم لہجہ اس کے مدنی ہونے کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ ان میں اکثر مومنین سے خطاب ہے۔

۳۔مکی سورتوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ ان میں اصولِ دین، اصل ایمان اور دعوت اسلام جیسی بحثیں ہیں جبکہ مدنی

[۱] البرھان: ج۱ص۱۸۹

سورتوں میں زیادہ تر اسلامی احکام کی تفصیلات اور اسلامی شریعت کا بیان ہے۔

۴۔ مکی سورتوں کی خصوصیات میں سے ہے: اخلاقیات کی پابندی، پختہ رائے، عقیدہ کی سلامتی، عناد و دشمنی اور ہٹ دھرمی ترک کرنے کی دعوت، مشرکانہ باطل عقائد کے مقابلہ میں استقامت و پائیداری کا مظاہرہ اور مشرکوں کے بے بنیاد اور فضول خیالات ونظریات کو اہمیت نہ دینا۔ جبکہ مدنی سورتوں کی خصوصیات میں سے ہے: اہل کتاب کے ساتھ میانہ روی سے پیش آنا اور انہیں عقاید ،افکار اور خیالات میں اعتدال کی دعوت دینا، منافقین سے مقابلہ کا طریقہ کار اور ان کی خصوصیات اور صفات کا بیان۔

۵۔ اکثر مکی سورتوں میں ''یاایھاالناس'' اور مدنی سورتوں میں ''یاایھاالذین آمنوا'' سے خطاب ہوا ہے۔

البتہ یہ خصوصیات جامعیت نہیں رکھتیں بلکہ صرف بعض سورتوں میں درست ہیں اگر ان میں سے چند خصوصیات یکجا ہو جائیں جو یقین وقطعیت کا سبب بنیں اور ان کے مخالف کوئی نص بھی نہ ہو تو قابلِ اعتماد ہیں اور قابل اطمینان ہیں اور اس صورت میں ان کا فقہی اور تاریخی موضوعات وغیرہ میں استعمال کا فائدہ ہے۔

لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ سورتوں کے مکی و مدنی ہونے کا معیار نقل روایت ہے جسے اصطلاح میں ''سماعی'' کہا جاتا ہے یا اجتہاد اور ظاہری شواہد ہیں جیسے جملہ بندی کا اسلوب، آیتوں اور سورتوں کا چھوٹا ہونا اور ان کا مسجع اور موزون ہونا یا نفس مضمون اور متن کے شواہد: جیسے اصولِ عقاید، احکام کا بیان، کفار اور منافقین سے پیش آنے کی کیفیت۔

ترتیب نزول

سورتوں کے نازل ہونے کی ترتیب پر موجود روایات بزرگان دین کے مورد اعتماد ہیں اکثر روایات ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف کتاب ''التمہید فی علوم القرآن'' اور کتاب ''علوم قرآنی'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔

علامہ طبرسیؒ اور اس فن کے دوسرے علماء فرماتے ہیں: سورتوں کی ترتیب کا معیار یہ ہے کہ ہر سورہ کی ابتداء دیکھی جائے۔ اگر کسی سورہ کی کچھ آیات نازل ہوئیں اور اس سورہ کے تمام ہونے سے پہلے یا اس درمیان کوئی دوسری مکمل سورہ یا چند سورتیں نازل ہو جائیں اور پھر ان کے بعد اس پہلی ناتمام سورہ کا بقیہ حصہ نازل ہو تو ایسی صورت میں ترتیب نزول کا معیار، ہر سورہ کے نازل ہونے کی ابتداء ہی ہوگی۔ جس طرح بعثت کے آغاز میں سورہ علق کی پہلی پانچ آیتیں نازل ہوئیں اور پھر کچھ سالوں بعد اس سورہ کا باقی حصہ نازل ہوا۔ سورہ مدثر اور سورہ مزمل بھی اسی طرح نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا ترتیب نزول کے لحاظ سے سورہ علق کو سب سے پہلی سورۃ شمار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان ج ۱ ص ۴۰۵ میں استاد احمد زاہد کی کتاب ''الایضاح'' سے نقل کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیبِ نزول ابن عباسؓ کی روایت، جابر بن زید کی تکمیلی روایت اور متعدد دیگر قابل اعتماد نسخوں کے مطابق درج ذیل دو جدول کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس ترتیب میں ''زمانی معیار'' اور پیغمبر اکرم کا مدینہ منورہ میں داخل ہونا مدنظر ہے۔

مکی سورتوں کی تعداد چھیاسی (۸۶) ہے جو ترتیب نزول کے لحاظ سے درج ذیل ہیں۔

ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورۃ کانام	ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورۃ کانام
۱	۹۶	علق	۲۷	۸۵	بروج
۲	۶۸	قلم	۲۸	۹۵	تین
۳	۷۳	مزمل	۲۹	۱۰۶	قریش
۴	۷۴	مدثر	۳۰	۱۰۱	قارعة
۵	۱	فاتحہ	۳۱	۷۵	قیامت
۶	۱۱۱	مسد	۳۲	۱۰۴	همزة
۷	۸۱	تکویر	۳۳	۷۷	مرسلات
۸	۸۷	أعلیٰ	۳۴	۵۰	ق
۹	۹۲	لیل	۳۵	۹۰	بلد
۱۰	۸۹	فجر	۳۶	۸۶	طارق
۱۱	۹۳	ضحیٰ	۳۷	۵۴	قمر
۱۲	۹۴	شرح	۳۸	۳۸	ص
۱۳	۱۰۳	عصر	۳۹	۷	اعراف
۱۴	۱۰۰	عادیات	۴۰	۷۲	جنّ
۱۵	۱۰۸	کوثر	۴۱	۳۶	یٰسٓ
۱۶	۱۰۲	تکاثر	۴۲	۲۵	فرقان
۱۷	۱۰۷	ماعون	۴۳	۳۵	فاطر
۱۸	۱۰۹	کافرون	۴۴	۱۹	مریم
۱۹	۱۰۵	فیل	۴۵	۲۰	طٰهٰ
۲۰	۱۱۳	فلق	۴۶	۵۶	واقعه
۲۱	۱۱۴	ناس	۴۷	۲۶	شعراء
۲۲	۱۱۲	اخلاص	۴۸	۲۷	نمل
۲۳	۵۳	نجم	۴۹	۲۸	قصص
۲۴	۸۰	عبس	۵۰	۱۷	بنی اسرائیل
۲۵	۹۷	قدر	۵۱	۱۰	یونس
۲۶	۹۱	شمس	۵۲	۱۱	هود

۵۳	۱۲	یوسف	۷۰	۱۶	نحل
۵۴	۱۵	حجر	۷۱	۷۱	نوح
۵۵	۶	انعام	۷۲	۱۴	ابراهیم
۵۶	۳۷	صافات	۷۳	۲۱	انبیاء
۵۷	۳۱	لقمان	۷۴	۲۳	مومنون
۵۸	۳۴	سباء	۷۵	۳۲	سجده
۵۹	۳۹	زمر	۷۶	۵۲	طور
۶۰	۴۰	غافر (مؤمن)	۷۷	۶۷	ملک
۶۱	۴۱	فصلت	۷۸	۶۹	حاقّه
۶۲	۴۲	شوریٰ	۷۹	۷۰	معارج
۶۳	۴۳	زخرف	۸۰	۷۸	نبأ
۶۴	۴۴	دخان	۸۱	۷۹	نازعات
۶۵	۴۵	جاثیه	۸۲	۸۲	انفطار
۶۶	۴۶	احقاف	۸۳	۸۴	انشقاق
۶۷	۵۱	ذاریات	۸۴	۳۰	روم
۶۸	۸۸	غاشیه	۸۵	۲۹	عنکبوت
۶۹	۱۸	کهف	۸۶	۸۳	مطفّفین

مدنی سورتوں کی تعداد اٹھائیس (۲۸) اور ان کی ترتیب نزول یہ ہے۔

ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورۃ کا نام	ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورۃ کا نام
۸۷	۲	بقرة	۱۰۱	۵۹	حشر
۸۸	۸	انفال	۱۰۲	۱۱۰	نصر
۸۹	۳	آلعمران	۱۰۳	۲۴	نور
۹۰	۳۳	احزاب	۱۰۴	۲۲	حج
۹۱	۶۰	ممتحنه	۱۰۵	۶۳	منافقون
۹۲	۴	نساء	۱۰۶	۵۸	مجادلة
۹۳	۹۹	زلزال	۱۰۷	۴۹	حجرات
۹۴	۵۷	حدید	۱۰۸	۶۶	تحریم
۹۵	۴۷	محمدؐ	۱۰۹	۶۲	جمعة

۹۶	۱۳	رعد	۱۱۰	۶۴	تغابن
۹۷	۵۵	رحمن	۱۱۱	۶۱	صفٰ
۹۸	۷۶	انسان(دھر)	۱۱۲	۴۸	فتح
۹۹	۶۵	طلاق	۱۱۳	۵	مائدۃ
۱۰۰	۹۸	بینہ	۱۱۴	۹	توبہ(برائت)

سورتوں کی ترتیبِ نزول کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا یہ سب ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق ہے کہ جسے زرکشیؒ اور طبریؒ نے نقل کیا ہے اور جابر بن زید کی روایت کے مطابق اس کی تصحیح اور تکمیل کی گئی ہے اس کے باوجود تیس (۳۰) سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلافِ نظر پایا جاتا ہے۔

سوالات

۱۔سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کی شناخت کا کیا فائدہ ہے مثال کے ساتھ بیان کریں؟

۲۔مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم بندی کے تین اہم معیار بیان کریں؟

۳۔مکی سورتوں کو مدنی سورتوں سے تشخیص دینے کیلئے تین اہم معیار بیان کریں؟

۴۔''زمانی معیار'' کے مطابق وہ آیات جو پیغمبر اکرم ﷺ پر مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے کے بعد مدینہ منورہ کے راستے میں نازل ہوئیں، مکی ہیں یا مدنی؟ آخر کیوں؟

۵۔مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم بندی میں ''خطابی معیار'' کی وضاحت کریں؟

۶۔مکی اور مدنی سورتوں کے پہچاننے کی چار خصوصیات بیان کریں؟

قرآن مجید کے اسماء اور اوصاف

قرآن پاک کے اسماء و اوصاف کی تعداد کے بارے میں مفسرین اور دانشوروں کے درمیان اختلافِ نظر پایا جاتا ہے۔ چھٹی صدی کے عظیم مفسر جمال الدین ابوالفتوح رازیؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں قرآن پاک کے تینتالیس (۴۳) نام بیان کیے ہیں[۱] کہ جن میں سے اکثر وصفی پہلو رکھتے ہیں۔

علامہ طبرسیؒ نے تفسیر "مجمع البیان" میں صرف چار اسماء "قرآن، فرقان، کتاب، ذکر" بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔[۲]

بدرالدین زرکشی نقل کرتے ہیں: حرالی نے اس بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآنِ پاک کے نوے (۹۰) سے زیادہ اسماء یا اوصاف بیان کیے ہیں۔[۳]

قاضی عزیزی نے قرآن کے پچپن (۵۵) اسماء اور عنوان نقل کیے ہیں جنہیں کتاب "علوم قرآن" میں شواہد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔[۴]

مذکورہ اسماء میں سے چار نام ایسے ہیں جنہیں خود قرآن کریم میں اس کے نام کے طور پر یاد کیا گیا ہے:

۱۔ قرآن: "بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ؛ یقیناً یہ بزرگ و برتر قرآن ہے"۔[۵]

۲۔ فرقان: "تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ؛ بابرکت ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا ہے"۔[۶]

۳۔ کتاب: "اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ؛ ہم نے آپ کی طرف یہ برحق کتاب نازل کی ہے"۔[۷]

---

۱) الروض الجنان و روح الجنان؛ ج ۱، مقدمہ ص ۵

۲) تفسیر مجمع البیان؛ ج ۱، مقدمہ، فن رابع، ص ۱۴

۳) البرہان؛ ج ۱، ص ۲۷۶ - ۲۷۳ / الاتقان؛ ج ۱، ص ۱۴۶ - ۱۴۳

۴) علوم قرآنی، ص ۱۰۹ - ۱۰۶

۵) سورۂ بروج / آیت ۲۱

۶) سورۂ فرقان / آیت ۱

۷) سورۂ نساء / آیت ۱۰۵

۴۔ ذکر: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ؛ ہم نے اس قرآن کو بتدریج نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ [1]

لفظ"قرآن"کا اشتقاق

یہ لفظ"قَرَأَ" سے"پڑھنے" کے معنیٰ میں لیا گیا ہے۔ ہمزہ اصل میں واؤ تھا اور مادۂ"قَرَوَ" سے"اکٹھا کرنے" کے معنیٰ میں ہے۔ کیونکہ قاری تلاوت کرتے ہوئے الفاظ اور حروف کو اکٹھا کرتا ہے۔ کتاب اور کتابت کی مانند جس کے معنیٰ"جمع کرنے" کے ہیں۔ جیسا کہ مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے کہا ہے:

لفظ قرآن مصدر ہے، جیسے: غفران، رحجان اور کفران۔ مثلاً:

"أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا؛ زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) کی نماز قائم کرو اور فجر کی نماز بھی کیونکہ فجر کی نماز (ملائکہ کے) حضور کا وقت ہے"۔ [2]

لفظ قرآن کے اشتقاق کے بارے میں اختلافِ نظر پایا جاتا ہے۔ اکثر محققین معتقد ہیں کہ یہ لفظ درحقیقت قَرْءَ سے لیا گیا ہے کہ جو اصل میں قَرْوَ تھا۔

ابن فارس (متوفی ۳۹۵ھ) کہتے ہیں:

"قاف، راء اور واؤ (حرفِ علت) ایک صحیح اصل ہے کہ جو جمع اور اجتماع پر دلالت کرتی ہے۔ قریہ (یعنی دیہات) بھی اسی مادے سے ہے کیونکہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن کا مادہ بھی یہی ہے کیونکہ وہ بھی احکام اور قصوں وغیرہ پر مشتمل ہے"۔ [3]

راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) مادہ قَرْوَ کے بارے میں کہتے ہیں:

"دراصل قرآن بھی کفران اور رجحان کی مانند مصدر ہے جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہوا ہے:

"إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْاٰنَهُ؛ فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهُ؛ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے، پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر آپ (بھی) اسی طرح پڑھا کریں"۔ [4]

اب یہ لفظ قرآن پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب کے نام کے طور پر خاص ہوگیا ہے۔ اسے قرآن کہا جاتا

---

۱) سورہ حجر/آیت ۹

۲) سورہ بنی اسرائیل/آیت ۷۸

۳) معجم مقاییس اللغۃ؛ ج۵، ص۷۹۔۷۸

۴) سورہ قیامت/آیت ۱۸۔۱۷

ہے کہ یہ تمام آسمانی کتابوں کے نتائج اور فوائد کی جمع آوری کرتا ہے۔[1]

بنابریں، قرآن درحقیقت مصدر اور مبنی للمفعول ہے۔ جس کے معنی مایُقرَءُ (پڑھا جانیوالا) ہے اور اب یہ پیغمبر اکرم پر نازل ہونی والی آسمانی کتاب کا خاص نام ہے۔

درحقیقت اس لفظ قرآن کی اصل بنیاد عربی ہے۔ وہ لوگ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں جو اس کی بنیاد کے عربی ہونے کا انکار کرتے ہیں اور اسے دوسری زبان سے عربی زبان میں داخل ہونے والا لفظ سمجھتے ہوئے کہتے ہیں: یہ لفظ (قرآن) دراصل سریانی زبان کے لفظ ''قریانہ'' سے لیا گیا ہے کہ جو آسمانی آیات اور نصوص کی تلاوت کے معنی میں تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ ایشیائی زبانوں کے آپس میں بہت سے مشترکات پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک زبان کسی دوسری زبان سے لی گئی ہو، البتہ اس بات کی دلیل ضرور ہے کہ ان زبانوں کی ''اصل'' مشترک ہے۔ کیا پتہ کہیں سریانی زبان عربی زبان سے نہ لی گئی ہو؟ کسی دوسری زبان سے داخل ہونے والے کلمات اور اصل کلمات میں فرق اشتقاق کا ہے۔ جس لفظ کا بھی اشتقاق ہو وہ اصیل ہے اور خاص طور پر اگر اس لفظ کے بہت سے مشتقات ہوں جیسے قرآن اور کتاب وغیرہ۔

سورہ کے معنا

لفظِ سورہ کو ''سورِ بلد'' (یعنی شہر کے گرد بلند دیوار) سے لیا گیا ہے کیونکہ ہر سورہ میں چند آیات ہوتی ہیں جنہیں اس سورہ نے احاطہ کیا ہوتا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کے معنی ''مقام و منزلت، ارتفاع و بلندی'' بیان کیے ہیں۔ ابن فارس نے سورہ کے معنی ''بلندی و ارتفاع'' اور ابوالفتوح رازی نے ''مقام و منزلت اور عزت و شرف'' بیان کیے ہیں اور ان کی دلیل نابغۂ ذبیانی کا یہ شعر ہے:

ألم تر ان الله أعطاك سورةً
ترىٰ كل ملك دونها يتذبذب

کیا نہیں دیکھتے کہ خداوند متعال نے تمہیں کتنا بلند، اعلیٰ مقام و منزلت اور عزت و شرف نصیب کیا ہے جس کے سامنے سب بادشاہ متزلزل نظر آتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ شہر کی فصیل کو بھی اس لیے سور کہا جاتا ہے کہ وہ بلند اور اونچی ہوتی ہے۔[2]

بعض دوسرے ماہرین لغت نے اسے ''سئور'' یعنی کسی چیز کا جزء اور باقی ماندہ حصہ'' کے معنی میں لیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق لفظ سورہ اصل میں ''سؤرہ'' قرآن مجید کے ایک حصہ کے معنی میں تھا۔ جس کے تلفظ میں سہولت کی غرض سے ہمزہ، واو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

---

۱) المفردات، ص ۴۰۲-۴۰۱

۲) الروض الجنان: ج ۱، مقدمہ، ص ۹

۴۔ذکر: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ؛ ہم نے اس قرآن کو بتدریج نازل کیا ہے اور یقینا ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ [1]

لفظ "قرآن" کا اشتقاق

یہ لفظ "قَرَأَ" سے "پڑھنے" کے معنیٰ میں لیا گیا ہے۔ ہمزہ اصل میں واوٴ تھا اور مادۂ "قَرَوَ" سے "اکٹھا کرنے" کے معنیٰ میں ہے۔ کیونکہ قاری تلاوت کرتے ہوئے الفاظ اور حروف کو اکٹھا کرتا ہے۔ کتاب اور کتابت کی مانند جس کے معنیٰ "جمع کرنے" کے ہیں۔ جیسا کہ مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے کہا ہے:

لفظ قرآن مصدر ہے، جیسے: غفران، رحجان اور کفران۔ مثلاً:

"أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا؛ زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) کی نماز قائم کرو اور فجر کی نماز بھی کیونکہ فجر کی نماز (ملائکہ کے) حضور کا وقت ہے"۔ [2]

لفظ قرآن کے اشتقاق کے بارے میں اختلافِ نظر پایا جاتا ہے۔ اکثر محققین معتقد ہیں کہ یہ لفظ درحقیقت قَرءَ سے لیا گیا ہے کہ جو اصل میں قَرَوَ تھا۔

ابن فارس (متوفی ۳۹۵ھ) کہتے ہیں:

"قاف، راء اور واوٴ (حرفِ علت) ایک صحیح اصل ہے کہ جو جمع اور اجتماع پر دلالت کرتی ہے۔ قریہ (یعنی دیہات) بھی اسی مادے سے ہے کیونکہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن کا مادہ بھی یہی ہے کیونکہ وہ بھی احکام اور قصوں وغیرہ پر مشتمل ہے"۔ [3]

راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) مادہ قَرَوَ کے بارے میں کہتے ہیں:

"دراصل قرآن بھی کفران اور رجحان کی مانند مصدر ہے جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہوا ہے:

"إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ؛ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ؛ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے، پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر آپ (بھی) اسی طرح پڑھا کریں"۔ [4]

اب یہ لفظ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب کے نام کے طور پر خاص ہوگیا ہے۔ اسے قرآن کہا جاتا

---

[1] سورۂ حجر/آیت ۹

[2] سورہ بنی اسرائیل/آیت ۷۸

[3] معجم مقائیس اللغۃ: ج۵، ص۷۹۔۷۸

[4] سورہ قیامت/آیت ۱۸۔۱۷

ہے کہ یہ تمام آسمانی کتابوں کے نتائج اور فوائد کی جمع آوری کرتا ہے۔[1]

بنابریں، قرآن درحقیقت مصدر اور مبنی للمفعول ہے ۔جس کے معنی مایُقرَءُ (پڑھاجانیوالا) ہے اور اب یہ پیغمبر اکرم پر نازل ہونی والی آسمانی کتاب کا خاص نام ہے۔

درحقیقت اس لفظ قرآن کی اصل بنیاد عربی ہے۔ وہ لوگ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں جو اس کی بنیاد کے عربی ہونے کا انکار کرتے ہیں اور اسے دوسری زبان سے عربی زبان میں داخل ہونے والا لفظ سمجھتے ہوئے کہتے ہیں: یہ لفظ (قرآن) دراصل سریانی زبان کے لفظ ''قریانہ'' سے لیا گیا ہے کہ جو آسمانی آیات اور نصوص کی تلاوت کے معنیٰ میں تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ ایشیائی زبانوں کے آپس میں بہت سے مشترکات پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک زبان کسی دوسری زبان سے لی گئی ہو، البتہ اس بات کی دلیل ضرور ہے کہ ان زبانوں کی ''اصل'' مشترک ہے۔ کیا پتہ کہیں سریانی زبان عربی زبان سے نہ لی گئی ہو؟ کسی دوسری زبان سے داخل ہونے والے کلمات اور اصل کلمات میں فرق اشتقاق کا ہے۔ جس لفظ کا بھی اشتقاق ہو وہ اصیل ہے اور خاص طور پر اگر اس لفظ کے بہت سے مشتقات ہوں جیسے قرآن اور کتاب وغیرہ۔

سورہ کے معنا

لفظِ سورہ کو ''سورِ بلد'' (یعنی شہر کے گرد بلند دیوار) سے لیا گیا ہے کیونکہ ہر سورہ میں چند آیات ہوتی ہیں جنہیں اس سورہ نے احاطہ کیا ہوتا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کے معنیٰ ''مقام و منزلت، ارتفاع و بلندی'' بیان کیے ہیں۔ ابن فارس نے سورہ کے معنیٰ ''بلندی وارتفاع'' اور ابوالفتوح رازی نے ''مقام ومنزلت اور عزت وشرف'' بیان کیے ہیں اور ان کی دلیل نابغۂ ذبیانی کا یہ شعر ہے:

ألم تر ان الله أعطاک سورةً

تریٰ کل ملک دونها یتذبذب

کیا نہیں دیکھتے کہ خداوند متعال نے تمہیں کتنا بلند، اعلیٰ مقام ومنزلت اور عزت وشرف نصیب کیا ہے جس کے سامنے سب بادشاہ متزلزل نظر آتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ شہر کی فصیل کو بھی اس لیے سور کہا جاتا ہے کہ وہ بلند اور اونچی ہوتی ہے۔[2]

بعض دوسرے ماہرین لغت نے اسے ''سور'' یعنی کسی چیز کا جزء اور باقی ماندہ حصہ'' کے معنیٰ میں لیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق لفظ سورہ اصل میں ''سؤرہ'' قرآن مجید کے ایک حصہ کے معنیٰ میں تھا۔ جس کے تلفظ میں سہولت کی غرض سے ہمزہ، واو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

---

۱) المفردات، ص ۴۰۲-۴۰۱

۲) الروض الجنان؛ ج ۱، مقدمہ، ص ۹

آیت کے معنیٰ

آیت کے معنیٰ ''علامت اور نشانی'' ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی ہر آیت خداوند متعال کے کلام کے درست اور صحیح ہونے کی نشانی ہے۔ جاحظ کہتے ہیں: خداوند متعال نے اپنی کتاب کا نام عربوں کی روش کے برخلاف رکھا ہے۔ اپنی پوری کتاب کا نام قرآن رکھا جیسا کہ عرب کسی شاعر کے تمام اشعار کے مجموعے کو دیوان کہتے ہیں ۔ اس کے کچھ حصے کو سورہ سے موسوم کیا۔ دیوان میں موجود قصیدے کی مانند اور قصیدے میں مذکور ہر بیت اور شعر کی طرح سورہ کے ایک حصے کو آیت کہا ہے۔[۱]

اس مطلب کا بیان کرنا ضروری ہے کہ ہر سورہ کا چند آیات پر مشتمل ہونا ایک توقیفی امر ہے یعنی ہر سورہ کی آیتوں کی تعداد کا کم یا زیادہ ہونا خود پیغمبر اکرم ﷺ کے خاص حکم سے انجام پایا ہے اور اسی طرح بغیر کسی ردوبدل کے ابھی تک باقی ہے اور اس میں اعجاز قرآن اور آیات کے باہمی تناسب سے مربوط ایک راز پوشیدہ ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک خاص حصے کو ''سورہ'' اور سورہ کے ایک حصے کو ''آیت'' کا نام دیا جانا خود قرآن ہی کے ذریعہ انجام پایا ہے۔ یہ نامگذاری سورۂ نور کی اس پہلی آیت میں مکمل طور پر واضح ہی: ''سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ، یہ ایسی سورت ہے کہ جسے ہم نے نازل کیا اور (اس پر عمل کرنے کو) فرض قرار دیا ہے اور اس میں واضح و روشن آیات نازل کی ہیں''۔[۲]

سورتوں کے نام

تمام سورتوں کی تعداد کی طرح ان کے نام بھی توقیفی ہیں جو پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم اور رائے کے مطابق رکھے گئے ہیں۔ عربوں کی روش اور طریقہ کے مطابق کسی بھی چھوٹی سی مناسبت سے سورتوں کے نام رکھے جاتے تھے۔[۳]

بعض سورتوں کی وجہ تسمیہ درج ذیل جدول میں بیان کی گئی ہے۔

سورۃ کا نام	وجہ تسمیہ
بقرہ	لفظِ بقرہ کا استعمال اور اس کے متعلق گفتگو صرف اسی سورہ میں ہے۔ اگر چہ لفظِ ''البقرۃ'' سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۴۴ اور ۱۴۶ میں اور لفظِ ''بقرات'' سورہ یوسف کی آیت نمبر ۴۳ اور ۴۶ میں آیا ہے۔ لیکن جس تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ میں گفتگو کی گئی ہے ان دو سورتوں میں نہیں ہے۔
آلِ عمران	لفظِ ''آلِ عمران'' صرف دو بار اسی سورہ کی آیت نمبر ۳۳ اور ۳۵ میں ذکر ہوا ہے اور پورے قرآن میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔
نساء	اس سورہ کی ستر (۷۰) آیات میں خواتین کے مسائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔
مائدہ	پورے قرآن میں صرف اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۱۲ اور ۱۱۴ میں لفظِ ''مائدہ'' استعمال ہوا ہے۔

۱) الاتقان: ج۱ص ۱۴۳

۲) سورہ نور، آیت ۱

۳) البرہان: ج۱ص ۲۷۰/ الاتقان: ج۱ص ۱۵۹

انعام	دوسری سب سورتوں سے بڑھ کر اس سورہ کی چھ آیتوں میں ''انعام'' کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔
اعراف	صرف اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۶ اور ۴۸ میں دو بار لفظِ ''اعراف'' ذکر ہوا ہے۔
انفال	صرف اسی سورہ کی پہلی آیت میں دو بار لفظِ ''انفال'' بیان ہوا ہے۔
توبہ	مشرکوں سے برائت اور بیزاری کا اظہار کرنے سے متعلق جیسا مطلب اس سورہ میں بیان ہوا ہے کسی اور مقام پر ایسا نہیں ہے۔
یونس	قرآن مجید کی صرف اسی سورہ میں حضرت یونسؑ کے بارے میں بات ہوئی ہے۔
ھود	صرف اسی سورہ میں ہی حضرت ہودؑ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
یوسف	اس سورہ میں پچیس (۲۵) مرتبہ حضرت یوسفؑ کے نام کا تکرار ہوا ہے۔
رعد	فقط یہی سورہ ہے جس کی آیت نمبر ۱۳ میں تسبیح رعد کے متعلق بیان ہوا ہے جبکہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹ میں صرف رعد کا نام لیا گیا ہے۔
ابراھیم	اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی شہر مکہ اور ان کی ذریتِ طیبہ (پاک نسل) کے بارے میں دعا کی تفصیل ہے۔
حجر	فقط یہی سورہ ہے جس میں اصحابِ حجر کے بارے میں بیان ہوا ہے۔
نحل	صرف یہی سورہ ہے جس میں نحل (شہد کی مکھی) کے متعلق بیان ہوا ہے۔
بنی اسرائیل	تنہا یہی سورہ ہے جس میں بنی اسرائیل کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔
کھف	صرف اسی سورہ میں اصحاب کہف کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔
مریم	تنہا یہی سورہ ہے جس کی آیت نمبر ۱۶ سے ۳۵ تک ''واذکر فی الکتاب مریم'' کے عنوان سے حضرت مریمؑ کی داستان بیان ہوئی ہے۔ جبکہ سورہ آلِ عمران میں عمران کی آل ہونے کے ناطے ان کے حالات کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔
طٰہٰ	اس سورہ کا آغاز لفظِ ''طٰہٰ'' سے ہوا ہے۔
انبیاء	یہ اکیلی سورہ ہے جس میں (عربوں کے نزدیک) مشہور انبیاء کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
حج	اس سورہ کی آیت نمبر ۲۵ سے ۳۸ تک حج کے احکام بیان کیے گئے ہیں اور حج کا اعلان بھی ہوا ہے'' واذن فی الناس بالحج یأتوک''۔
مومنون	اس سورہ کا آغاز جملہ ''قد أفلح المومنون'' سے ہوا ہے۔
نور	اس سورہ میں ''آیتِ نور'' بیان ہوئی ہے۔
فرقان	اس سورہ میں قرآن کو ''فرقان'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے نزول کی یاددہانی کرائی گئی ہے اور خداوندِ متعال نے خود اپنے آپ کو مبارک باد دی ہے۔
شعراء	صرف یہی سورہ ہے جس میں لفظِ ''شعراء'' استعمال ہوا ہے۔
نمل	فقط اسی سورہ میں نمل (چیونٹی) کے بارے میں بیان ہوا ہے۔
قصص	اس سورہ میں عبارت ''قص علیه القصص'' فعل اور مصدر دونوں ذکر ہوئے ہیں۔ اگرچہ سورہ یوسف میں بھی عبارت ''نحن نقص علیک أحسن القصص'' بیان ہوئی ہے لیکن اس سورہ میں اولویت اور برتری حضرت یوسفؑ کے نام کی وجہ سے تھی کہ جس کا تکرار اس سورہ میں پچیس (۲۵) بار ہوا ہے۔
عنکبوت	فقط یہی سورہ ہے جس میں عنکبوت (مکڑی) کا نام لیا گیا ہے۔
روم	صرف اسی سورہ میں یہ نام ''روم'' استعمال ہوا ہے۔
سجدہ	اس سورہ کا یہ نام ''آیتِ سجدہ'' پر مشتمل ہونے کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اگرچہ تین دوسری سورتوں میں بھی آیتِ سجدہ ہے لیکن ان میں اولویت دوسرے ناموں کی ہے۔

احزاب	صرف اسی سورہ میں ''واقعہ احزاب'' بیان ہوا ہے۔
سبأ	صرف اسی سورہ میں لفظِ ''سبأ'' ذکر ہوا ہے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا سورتوں کی نامگذاری میں کوئی نہ کوئی مناسبت پائی جاتی ہے۔ البتہ یہ صرف ان مذکورہ عوامل اور اسباب میں منحصر نہیں ہے کیونکہ نامگذاری میں کمترین مناسبت کافی ہے۔

سورتوں کے متعدد نام

اکثر سورتوں کا ایک نام ہے جبکہ بعض سورتوں کے دو تین یا اس سے زیادہ نام بھی ہیں۔ سورتوں کے ناموں کا متعدد ہونا کسی خاص جہت سے ہے مثال کے طور پر سورہ حمد کے دوسرے نام: فَاتِحةُ الکتاب، اُمّ الکتاب اور السبعُ المثانی ہیں۔ جبکہ علامہ جلال الدین سیوطی نے اس سورہ کے بیس (۲۰) سے زیادہ نام ذکر کیے ہیں۔ [۱]

اس سورہ کے حمد کے علاوہ تین نام اور بھی ہیں یہ نام اور وجہ تسمیہ درج ذیل ہیں:

فاتحۃ الکتاب: یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ سورہ حمد قرآن مجید کی سب سے پہلی سورہ ہے۔ نہ صرف قرآن کریم میں پہلی سورہ کے عنوان سے ثبت ہوئی ہے، بلکہ آسمان سے نازل ہونے والی بھی سب سے پہلی مکمل سورہ یہی ہے۔

اُمّ الکتاب: اُمّ کے معنیٰ ''ہدف اور مقصد'' ہے۔ سورہ حمد کو ''اُمّ الکتاب'' اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ قرآن پاک کے تمام اہداف، اغراض اور مقاصد اسی چھوٹی سی سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ اسی لیے اس سورہ کو قرآن مجید کی بافضیلت ترین سورتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

السبع المثانی: کیونکہ سورہ حمد سات آیتوں پر مشتمل ہے اس لیے اسے ''السبع'' کہا گیا ہے اور بڑی سورتوں کی نسبت چھوٹی سورتیں زیادہ تلاوت ہوتی ہیں اور قابلِ تکرار ہیں اسی بناء پر اسے ''مثانی'' کہا جاتا ہے۔

ذیل میں بعض سورتوں کے متعدد نام نمونے کے طور پر بیان کیے جا رہے ہیں۔

سورہ	دوسرا نام	سورہ	دوسرا نام	سورہ	دوسرا نام
توبہ	برائت	اسراء	بنی اسرائیل سبحان	نمل	سلیمان
غافر	مؤمن	فصلت	سجدہ	محمد	قتال
قمر	اقتربت	ملک	تبارک	معارج	سَأل، واقعہ
نبأ	عمّ	بینہ	لم یکن	ماعون	دین، أرأیت
مسدّ	تبت	توحید	اخلاص	دھر	انسان، ھل أتی
قریش	ایلاف	شرح	انشراح		

۱) الاتقان؛ ج۱، ص۱۵۱

قرآنی سورتوں کے گروہی نام

بعض سورتوں کے گروہی نام رکھے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔سبع طوال: قرآن مجید کی سات بڑی سورتیں ''سورہ بقرہ، سورہ آلِ عمران، سورہ نساء، سورہ مائدہ، سورہ اعراف، سورہ انعام اور دو سورتیں انفال و برائت ہیں'' کہ جنہیں ایک سورہ شمار کیا گیا ہے۔

۲۔ مئین: قرآن مجید کی وہ بارہ سورتیں جن میں آیات کی تعداد سو(۱۰۰) سے زیادہ ہے لیکن ان کا حجم سبعِ طوال (سات بڑی سورتوں) کے برابر نہیں ہے۔وہ یہ ہیں: سورہ یونس، سورہ ہود، سورہ یوسف، سورہ نحل، سورہ بنی اسرائیل، سورہ کھف، سورہ مریم، سورہ طٰہٰ، سورہ انبیاء سورہ مؤمنون، سورہ شعراء، سورہ صافات۔

۳۔ مثانی: قرآن مجید کی وہ بیس (۲۰) سورتیں جن میں آیتوں کی تعداد سو(۱۰۰) سے کم ہے اور انہیں مثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سورتیں چھوٹی ہونے کے سبب بار بار پڑھی جاسکتی ہیں۔

۴۔حوامیم: قرآن مجید کی وہ سات (۷) سورتیں کہ جن کا آغاز ''حم'' سے ہوتا ہے۔وہ درج ذیل ہیں: سورہ مومن، سورہ فصّلت (سجدہ)، سورہ شوریٰ، سورہ زخرف، سورہ دخان، سورہ جاثیہ، سورہ احقاف۔

۵۔ ممتحنات: یہ تقریباً بیس (۲۰) سورتیں ہیں: سورہ فتح، سورہ حشر، سورہ سجدہ، سورہ طلاق، سورہ نٓ والقلم، سورہ حجرات، سورہ ملک، سورہ تغابن، سورہ منافقون، سورہ جمعہ، سورہ صفّ، سورہ جنّ، سورہ نوح، سورہ مجادلہ، سورہ ممتحنہ، سورہ تحریم۔

۶۔مفصلات: سورہ الرحمن سے لے کر قرآن مجید کے آخری سورہ والناس تک (ان چند سورتوں کے علاوہ جن کا شمار ممتحنات اور مئین میں ہے) ان سورتوں کی آیات کے درمیان فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے، انہیں ''مفصلات'' کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی تعداد

قرآن مجید ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں کے ساتھ اسی موجودہ شکل میں، نہ کم نہ زیادہ، پیغمبر اکرم ﷺ سے صحابہ کرامؓ اور تابعینِ ذوی الاحترام کی نقلِ روایت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔قرآن پاک کی سورتوں کی تعداد کا ایک سو چودہ (۱۱۴) ہونا متواتر ہے جبکہ اس سے زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہے اور اس سے کم کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

آیتوں کے درمیان موجود فاصلہ کا تعین (کہ فلاں آیت کہاں ختم ہورہی ہے) ایک توقیفی امر ہے کہ جو پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم اور رائے سے انجام پایا ہے اور آپ ﷺ ہی سے منقول ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مطلب کے پورے ہونے سے آیت بھی ختم ہوجائے۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطلب کے دوران ہی آیت ختم ہوجاتی ہے جبکہ مطلب ابھی باقی ہوتا ہے اور بعد والی آیت میں پورا ہوتا ہے۔پس ہر آیت کا چھوٹا یا بڑا ہونا اس میں درج شدہ

مطلب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک توقیفی امر ہے۔

گذشتہ لوگوں کا آیتوں کی تعداد کے بارے میں کچھ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کسی آیت کی تلاوت کرتے ہوئے کسی مقام پر وقف کرتے (ٹھہر جاتے) اور تلاوت جاری نہیں رکھتے تھے جس سے یہ گمان ہوتا تھا کہ آیت ختم ہوگئی ہے۔

ابن عباسؓ سے منقول ہے: قرآن مجید کی کل چھ ہزار چھ سو (۶۶۰۰) آیات اور تین لاکھ بیس ہزار چھ سو اکہتر (۳۲۰۶۷۱) حروف ہیں جبکہ قرآن مجید کے کلمات کے بارے میں اختلاف ہے بعض نے ستتر ہزار دو سو ستتر (۷۷۲۷۷) اور ایک گروہ کی نگاہ میں ستتر ہزار نو سو چونتیس (۷۷۹۳۴) الفاظ اور ایک دوسرے گروہ نے ستتر ہزار چار سو چونتیس (۷۷۴۳۴) اور بعض نے ستتر ہزار آٹھ سو سات (۷۷۸۰۷) کلمات شمار کیے ہیں۔

کوفیوں کی روایت کے مطابق (جو صحیح ترین اور یقینی ترین روایات میں سے ہے) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے: قرآن مجید کی آیات کی صحیح تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس (۶۲۳۶) ہے۔[1]

اب موجودہ مصحف میں قرآن مجید کی آیات کی تعداد بھی یہی ہے۔ آیات کی یہ تعداد اس بات پر مبنی ہے کہ سورہ حمد میں ''بسم اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم'' ایک آیت شمار ہو جبکہ باقی دوسری تمام سورتوں میں ''بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم'' مستقل آیت شمار نہ ہو اور دوسرا یہ کہ سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطعات بھی ایک آیت شمار ہوں۔

سوالات

۱۔ قرآن کریم کے کتنے نام بیان کئے گئے ہیں؟ چار ایسے نام بیان کریں جن کا ذکر خود قرآن کریم میں ہوا ہے؟

۲۔ سورہ اور آیت کے معنی کیا ہیں؟ قرآن کریم کے متعلق سورہ اور آیت کا استعمال کیسے ہوا ہے؟

۳۔ سورتوں کی نامگذاری، ان کی آیتوں کی تعداد کیسے اور کس کے ذریعہ انجام پائی؟

۴۔ سورہ حمد کے تین دوسرے مشہور نام اور ان کی وجہ تسمیہ بیان کریں؟

۵۔ قرآن کریم کی سورتوں سے مربوط ان ناموں (سبع طوال، مئین، مثانی، حوامیم، ممتحنات، مفصلات) سے کیا مراد ہے؟

۶۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول روایت کے مطابق قرآن کریم کی آیات کی صحیح تعداد کتنی ہے؟ اور اُس کے مطابق ہر سورہ میں ''بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم'' کا شمار کیسا ہے؟

۷۔ قرآن کریم کی آیات کی تعداد کے بارے میں گذشتہ علماء کے درمیان جزئی اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟

---

۱) الاتقان؛ ج۱، ص۱۹۰۔ ۱۸۹ اور ۱۹۷؛ کوفیوں کی یہ روایت ابن ابی لیلیٰ سے اس نے ابو عبد الرحمان سُلمی سے اور انہوں نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کی ہے۔

آٹھواں سبق

قرآن کریم کی جمع آوری اور تدوین

قرآن مجید کی موجودہ شکل میں جمع آوری اور تدوین کسی ایک خاص زمانے میں نہیں ہوئی۔ بلکہ نزول قرآن کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف افراد اور گروہوں کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔ تمام سورتوں کی ترتیب، نظم وضبط اور آیات کی تعداد توقیفی ہے یعنی یہ سب کام نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں آپؐ ہی کے حکم سے انجام پایا ہے۔ ہر سورہ ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم'' کے نازل ہونے سے شروع ہوتی اور ترتیب نزول کے مطابق آیات اس میں ثبت ہوتی رہتیں یہاں تک کہ دوسری ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم'' نازل ہوتی اور باقاعدہ طور پر دوسری سورہ کا آغاز ہوجاتا۔

قرآن مجید کی آیتوں کا طبیعی طور پر نظم اور ترتیب یہی تھی۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق ''جبرائیل کی نشاندہی پر'' کوئی آیت اپنے طبیعی نظم کے برخلاف کسی دوسری سورہ میں رکھی جاتی بطور مثال آیت ''وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللهِ، ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ''[1] یہ آیت نازل ہونے والی آخری آیات میں سے ہے لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم پر اسے سورہ بقرہ میں ''آیتِ رِبا'' اور ''آیتِ دَین'' کے درمیان دوسو اکیاسی (۲۸۱) نمبر پر لکھا گیا۔ لہٰذا سورتوں میں اس طرح آیات کا لکھا جانا چاہے نظم طبیعی کی صورت میں ہو یا نظم حکمی کی صورت میں توقیفی ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کی ذاتی نظارت اور حکم سے انجام پایا ہے۔

البتہ سورتوں کی نظم و ترتیب کے متعلق محققین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ بہت سے دیگر محققین اور ہمعصر علماء میں سے آیۃ اللہ سید ابوالقاسم خوئیؒ کا نظریہ ہے کہ: قرآن مجید پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں اسی موجودہ شکل وصورت میں موجود تھا۔ کیونکہ یہ بات بعید از قیاس دکھائی دیتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس اہم مسئلہ کو اسی طرح چھوڑ دیا ہوتا کہ آپ ﷺ کے بعد اسے منظم و مرتب کیا جاسکے۔

اکثر محققین اور مورخین کی نگاہ میں قرآن مجید کی سورتوں کا نظم و ترتیب رحلتِ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد سب سے پہلے حضرت علیؑ نے انجام دی۔ پھر ان کے بعد زید بن ثابتؓ اور دوسرے اکابر صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں یہ کام انجام پایا۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے

---

[1] سورۂ بقرہ/آیت ۲۸۱

کہ رحلتِ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں قرآن مجید کی جمع آوری اور تدوین کا کام تاریخی مسلّمات میں سے ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام قرآن مجید کی جمع آوری میں مشغول ہوئے۔روایات کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نے پورے چھ مہینے اپنے گھر میں بیٹھ کر قرآن مجید یکجا طور پر ایک مصحف کی صورت میں جمع کیا۔

ابن ندیم کہتے ہیں:

''سب سے پہلے جو مصحف جمع ہوا وہ حضرت علی علیہ السلام کا مصحف تھا اور یہ مصحف آل جعفر کے پاس تھا وہ مزید کہتے ہیں: میں نے ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس ایک مصحف دیکھا جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور اس کے کچھ صفحے گر چکے تھے اور حسن بن علی علیہ السلام کی اولاد نے اسے میراث میں پایا تھا۔[۱]

محمد بن سیرین، عکرمہ سے نقل کرتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے شروع ہی میں حضرت علی علیہ السلام خانہ نشین ہو گئے اور انہوں نے قرآن مجید کی جمع آوری کی۔ میں نے عکرمہ سے پوچھا: کیا حضرت علی علیہ السلام کا مصحف نظم وترتیب میں دوسرے مصاحف کی مانند تھا؟ کیا اس میں ترتیب نزول کا لحاظ رکھا گیا تھا؟ عکرمہ نے جواب دیا: اگر جن وانس بھی آپس میں مل کر چاہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی طرح قرآن مجید کو جمع آوری کریں تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ ابن سیرین مزید کہتے ہیں: میں نے مصحفِ علی علیہ السلام کو دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے یہ سعادت نصیب نہ ہو سکی۔[۲]

ابن جزی کلبی کہتے ہیں:

اگر مصحف حضرت علی علیہ السلام مل جاتا تو اس سے بہت زیادہ علم نصیب ہوتا۔[۳]

مصحف حضرت علی علیہ السلام کی خصوصیات

جس مصحف کی حضرت علی علیہ السلام نے جمع آوری وتدوین کی وہ متعدد منفرد خصوصیات پر مشتمل تھا جو دوسرے مصاحف ان خصوصیات پر مشتمل نہ تھے۔

۱۔ آیتوں اور سورتوں کی ترتیب نزول کے عین مطابق تھی یعنی اس مصحف میں مکّی سورتیں مدنی سورتوں سے پہلے تھیں اور آیتوں کے تاریخی مراحل واضح تھے اس طرح تشریع (قانون گذاری) اور احکام کے مراحل واضح ہو جاتے، خاص طور پر قرآن مجید

---

۱) الفہرست؛ ص ۴۸-۴۷

۲) طبقات ابن سعد؛ ج ۲ ص ۱۰۱؛ الاتقان؛ ج ۱ ص ۵۷

۳) طبقات ابن سعد؛ ج ۲ ص ۱۰۱؛ الاتقان؛ ج ۱ ص ۵۷

میں ناسخ اور منسوخ کے مسئلہ کا بخوبی پتہ چل جاتا۔

۲۔ اس مصحف میں پیغمبر اکرم ﷺ کی قرائت کے عین مطابق آیات لکھی ہوئی تھیں جن کی قرائت میں ہرگز اختلاف کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا کسی بھی آیت کے مضمون اور مفہوم کو بہتر انداز میں سمجھنے اور اس کی صحیح تفسیر حاصل کرنے کا راستہ ہموار تھا اور یہ بات بہت اہمیت کی حامل تھی۔ کیونکہ بسا اوقات اختلاف قرائت ہی، مفسر کی گمراہی کا سبب بنتی ہے جبکہ مصحف حضرت علی علیہ السلام میں گمراہی کا سبب بننے والی ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

۳۔ یہ مصحف تنزیل اور تاویل پر مشتمل تھا یعنی آیتوں اور سورتوں کا شان نزول یا وہ مناسبتیں (واقعات، حوادث) جو اُن کے نازل ہونے کا سبب بنیں، اس مصحف کے حاشیہ میں ان کے بارے میں توضیح دی گئی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام کے یہ حاشیے قرآن مجید کے معانی سمجھنے اور بہت سے ابہامات دور کرنے کا بہترین ذریعہ تھے۔ اس مصحف کے حاشیہ پر آیتوں کے اسباب نزول بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تاویلیں بھی بیان کی گئی تھیں۔ یہ تاویلیں ان (آیتوں) کے خاص موارد سے حاصل کی گئی تھیں جامع اور کلی مضامین تھے جو اُن آیتوں کے سمجھنے میں بہت زیادہ موثر تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میں نے ان کیلئے ایسی کتاب پیش کی جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھی"۔[1]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

"کوئی بھی آیت پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ انہوں نے اسے میرے لیے قرائت کیا، املاء کرایا اور میں نے اسے خود اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اس کے علاوہ مجھے تفسیر اور تاویل، ناسخ اور منسوخ، محکم اور متشابہ کی تعلیم دی اور میرے لیے دعا کی کہ خداوند مجھے فہم و ادراک اور حافظہ عطا فرمائے۔ اس دن کے بعد سے آج تک نہ تو میں نے کسی آیت کو فراموش کیا ہے اور نہ ہی پیغمبر اکرم ﷺ کے تعلیم دیے ہوئے اس علم و دانش میں سے کوئی بھی چیز مجھ سے ضایع ہوئی"۔[2]

اگر پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد آیتوں کی شرح اور تفسیر، تنزیل اور تاویل پر مشتمل حضرت علیؑ کے مصحف سے استفادہ کیا جاتا تو آج قرآن فہمی میں درپیش اکثر مشکلات حل ہو چکی ہوتیں۔

مصحف حضرت علی علیہ السلام کا انجام

سلیم بن قیس ہلالی (متوفی ۹۰ھ) جو حضرت علی علیہ السلام کے خاص اصحاب میں سے تھے؛ سلمان فارسی سے یوں روایت کرتے ہیں:

---

[1] آلاء الرحمان: ج ۱ ص ۲۵۷

[2] تفسیر البرہان: ج ۱ ص ۱۶ ح ۱۴ و ۱۴

جب حضرت علیؑ نے اپنے متعلق لوگوں کی بے رغبتی محسوس کی تو آپ خانہ نشین ہو گئے اور قرآن مجید کو مکمل طور پر اکٹھا اور جمع کر لینے تک گھر سے باہر نہ نکلے۔ جبکہ اس سے پہلے قرآن مجید مختلف جگہوں پر لکڑی کے باریک تختوں اور کاغذوں پر لکھا ہوا تھا۔

یعقوبی کی روایت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام اس مصحف کو مکمل کرنے کے بعد اونٹ پر لاد کر مسجد النبی ﷺ لائے اس وقت لوگ حضرت ابوبکرؓ کے گرد جمع تھے۔ آپ نے ان سے کہا: پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی جمع آوری میں مشغول تھا۔ جو کچھ پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوا اِس کپڑے میں جمع کر لایا ہوں۔ کوئی آیت ایسی نہیں، ہے مگر یہ کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ نے اسے میرے لیے قرائت کیا اور اس کی تفسیر اور تاویل بھی مجھے تعلیم دی۔ ایسا نہ ہو کل تم کہو: ہم اس سے غافل تھے۔ تو اس وقت اس گروہ کا ایک سرکردہ شخص کھڑا ہوا، جو کچھ حضرت علی علیہ السلام لائے تھے دیکھ کر آپؑ سے کہنے لگا: جو کچھ تم لائے ہو ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اب اسے کبھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ پھر آپؑ اپنے گھر چلے گئے اور اس کے بعد کسی نے اس مصحف کو نہ دیکھا۔[1]

عہدِ عثمانؓ میں جب مصاحفِ صحابہ کے طرفداروں میں شدید اختلاف رونما ہوا تو طلحہ بن عبید اللہ نے حضرت علیؑ سے عرض کی: یاد ہے جب آپؑ نے اپنا مصحف لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ کیا اچھا ہو کہ آج اسے پیش کریں شاید لوگوں میں اختلاف ختم ہو جائے؟ آپؑ نے اس کا جواب نہ دیا۔ طلحہ نے دوبارہ سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: میں نے جان بوجھ کر جواب نہیں دیا۔ تب آپؑ نے طلحہ سے کہا: آج جو قرآن لوگوں کے پاس ہے کیا پورے کا پورا قرآن ہے یا قرآن کے علاوہ کچھ اور بھی اس میں شامل ہے؟ طلحہ نے جواب دیا: البتہ سب قرآن ہے۔ آپؑ نے فرمایا: اب جبکہ ایسا ہے تو اسے حاصل کرو اور اس پہ عمل کرو تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ طلحہ نے کہا: ''اگر ایسا ہے تو ہمارے لیے کافی ہے'' اور پھر اس نے مزید کچھ نہ کہا۔[2]

حضرت علی علیہ السلام اس جواب کے ذریعہ چاہتے تھے کہ اتحاد کی فضا برقرار رہنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا استحکام اور پائیداری بھی محفوظ رہے۔

زید بن ثابت کا قرآن جمع کرنا

پیغمبر اکرم ﷺ کی وصیت تھی کہ قرآن مجید کو جمع کیا جائے تاکہ یہودیوں کی کتاب تورات کی طرح یہ بھی ضائع نہ ہو جائے۔[3] آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے قرآن مجید کی جمع آوری کر کے اسے پیش کیا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اسے قبول نہ کیا گیا۔ چونکہ قرآن مجید اسلامی آئین کی تشریع اور قانون گذاری کا اوّلین منبع، ماخذ اور

۱) السقیفہ، ص ۸۲

۲) السقیفہ، ص ۱۲۴

۳) تفسیر قمی، ص ۷۴۵

اسلامی معاشرے کی تشکیل کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ خلفائے وقت دوسرے کاتبین وحی سے استفادہ کرتے، قرآن مجید کو لکڑیوں کی باریک تختیوں، ہڈیوں کے ٹکڑوں اور حفاظِ کرام کے سینوں سے اکٹھا کر کے منظم انداز میں لکھتے اور بالخصوص جنگ یمامہ میں شہید ہونے والے قرآن کریم کے ستر (۷۰) یا ایک قول کے مطابق ۴۰۰ (چارسو) حافظوں کی کمی بھی پوری ہو جاتی جو مسلمانوں کیلئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اسی بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ سے قرآن جمع کرنے کو کہا۔

زید بن ثابت کہتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ نے مجھے بلوایا اور حضرت عمرؓ (جو وہاں موجود تھے) کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد کہا: جنگ یمامہ میں حافظوں اور قاریوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہو چکی ہے اور اس بات کا ڈر ہے کہ کسی دوسرے حادثہ میں باقی حافظوں اور قاریوں کے شہید ہونے سے قرآن مجید ضائع نہ ہو جائے۔ لہٰذا قرآن مجید جمع کرنے کی تجویز پیش کی۔ میں نے کہا: آپ لوگ یہ کام کیسے انجام دینا چاہتے ہیں کہ جسے خود رسول اکرم ﷺ نے انجام نہیں دیا؟ انہوں نے کہا یہ بہت اہم کام ہے کہ جس کا انجام پانا بہت ضروری ہے۔ وہ اس کام کے انجام دینے پر مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے قبول کر لیا اور ان کا ہم خیال بن گیا۔ اُس وقت حضرت ابوبکرؓ نے مجھے کہا: ہماری نظر میں تم ایک عقلمند اور قابل اعتماد جوان ہو اور کاتبِ وحی بھی ہو لہٰذا اس کام (جمع قرآن) کو بخوبی انجام دے سکتے ہو۔

زید بن ثابت مزید کہتے ہیں: اس کام (جمعِ قرآن) کا انجام دینا میرے لیے پہاڑ کو اُس کی جگہ سے ہٹانے سے کہیں زیادہ سخت اور دشوار تھا لیکن مجبوراً میں نے اُسے قبول کیا اور قرآن کو پتھر، لکڑی کے تختوں اور لوگوں کے سینوں سے اکٹھا کر کے جمع کر دیا۔[1]

جمع قرآن میں زید کا اسلوب

زید بن ثابت نے منتشر قرآن اکٹھا کر کے ایک مصحف کی صورت میں جمع کیا۔ اُس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ جس کے پاس قرآن مجید کا جتنا حصہ بھی ہے اُسے لے آئے۔

یعقوبی کہتے ہیں:

زید بن ثابت نے اپنی سربراہی میں (۲۵) افراد پر مشتمل ایک گروہ تشکیل دیا۔ اس گروہ کے ممبران ہر روز صبح مسجد میں اکٹھے ہوتے اور وہ افراد جن کے پاس قرآن کی کوئی آیت یا سورہ ہوتی اس گروہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یہ گروہ اُس وقت تک کسی سے کوئی بھی چیز قرآن کے عنوان سے قبول نہیں کرتا تھا جب تک اُن کے لانے والے اس کے قرآن ہونے پر درج ذیل دو گواھیاں پیش نہیں کرتے تھے۔

پہلی گواہی: خطی نسخہ یعنی کوئی بھی لکھی ہوئی چیز جو اُس کے قرآنی وحی ہونے پر دلالت کرے۔

---

[1] صحیح بخاری؛ ج ۶ ص ۲۲۵ / مصاحف سجستانی ص ۶ / البرہان؛ ج ۱ ص ۲۳۳

دوسری گواہی: حفظی یعنی دوسرے افراد بھی اس بات کی گواہی دیں کہ انہوں نے بھی اسے پیغمبر اکرم ﷺ سے سنا ہے۔
اس طرح زید بن ثابت نے قرآن مجید کی آیتوں اور سورتوں کو منتشر اور ضائع ہونے سے بچا لیا۔ جب ایک سورہ پوری ہو جاتی اُسے (رَبعہ) نامی کھال کے ایک صندوق میں رکھ دیتے تھے۔ یہاں تک کے ایک ایک کر کے ساری سورتیں مکمل ہو گئیں لیکن سورتوں کو نظم اور ترتیب نہ دی۔[1]

یہ صحیفے جن پر قرآنی سورتیں درج تھیں مکمل ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کیے گئے۔ جو اُن کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو منتقل ہوئے اور ان کی وفات کے بعد اُن کی بیٹی حضرت حفصہ اُس کی حفاظت کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ صحیفوں یکساں کرنے کے موقع پر حضرت عثمانؓ نے ان کو حفصہ سے عاریتاً لیا تا کہ قرآن مجید کے دوسرے نسخوں سے اس کا مقایسہ کریں۔ پھر حضرت عثمانؓ نے حفصہ کو یہ امانت واپس کر دی۔ حفصہ کی موت کے بعد مروان (جو معاویہ کی طرف سے مدینہ کا گورنر تھا) نے اسے حفصہ کے وارثوں سے لیکر ضائع کر دیا۔[2]

صحابہ کرامؓ کے مصاحف

پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت اور مصحف حضرت علی علیہ السلام کے قبول نہ کیے جانے کے بعد زید بن ثابت کے علاوہ بعض دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی قرآن جمع کیا۔ جن میں عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، مقداد بن اسود، سالم مولی ابن حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے سب سے پہلے سالم مولی ابی حذیفہ نے قرآنی سورتیں مرتب کیں۔ جب قرآن جمع ہو کر اوراق پر لکھا جا چکا اُس وقت سالم مولی ابی حذیفہ اور اس کے ساتھیوں نے مل بیٹھ کر اُس کے نام کے بارے میں مشورہ کیا۔
بعض نے اُس کا نام "سِفر" رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن سالم اور دوسرے افراد کو یہ تجویز پسند نہ آئی کیونکہ "سِفر" یہودیوں کی ایک کتاب کا نام تھا۔ پھر سالم نے اُس کا نام "مصحف" تجویز کیا اور کہا کہ میں نے حبشہ میں اس کتاب کی طرح (جمع شدہ صحیفوں) دیکھا ہے جسے "مصحف" کہتے تھے۔ تمام حاضرین نے ان جمع شدہ صحیفوں کے لیے "مصحف" کا نام قبول کر لیا۔[3]
یہ بات واضح رہے کہ قرآن "ما یقرأ" اس چیز کا نام ہے جسے پڑھا جاتا ہے۔ لیکن جب صحیفوں سے کتابی شکل میں آ گیا تو "مصحف" کہلانے لگا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ج ۱ص ۲۶۱/ البرہان: ج ۲ص ۳۵/ الاتقان: ج ۱ص ۵۸/ فتح الباری: ج ۹ص ۱۶/ مناہل العرفان: ج ۱ص ۲۵۴/ فجر الاسلام، ص ۱۹۵

[2] ارشاد الساری فی شرح البخاری: ج ۷، ص ۴۴۹/ التمہید: ج ۱ص ۳۰۰

[3] الکامل فی التاریخ: ج ۳ص ۵۵/ الاتقان: ج ۱ص ۵۸/ مصاحف سجستانی، ص ۱۴-۱۱

سوالات

۱۔ سورتوں میں آیات کی نظم و ترتیب کے توقیفی ہونے سے کیا مراد ہے؟

۲۔ مشہور نظریہ کے مطابق سورتوں کے درمیان نظم و ترتیب کب برقرار ہوئی؟ اور سب سے پہلے یہ کام کس نے انجام دیا؟

۳۔ حضرت علی علیہ السلام کا مصحف کن منفرد خصوصیات پر مشتمل تھا؟

۴۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں قرآن کریم کے جمع کرنے کا اقدام کس بنا پر ہوا؟

۵۔ قرآن کریم کے جمع کرنے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا اسلوب کیا تھا اور ان کے مصحف کا انجام کیا ہوا؟

۶۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ دوسرے کن افراد نے قرآن کریم جمع کیا؟

۷۔ ''قرآن'' کے لفظی معنی کیا ہیں اور اس کا نام ''مصحف'' کب رکھا گیا؟

نواں سبق

اختلافِ مصاحف

جیسا کہ بیان ہوا پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد کا زمانہ قرآن مجید کی جمع آوری کا دور کہلاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک نے اپنے علم و دانش، اہلیت اور صلاحیت کے مطابق قرآنی آیات جمع کر کے اور سورتوں کو ترتیب دیکر اپنے لیے مخصوص مصحف مرتب کرلیا۔ بعض صحابہ جو یہ کام انجام نہ دے سکتے تو دوسروں کو کہتے تھے کہ وہ ان کے لیے مصحف کی نسخہ برداری کریں یا ان کے لیے قرآن مجید کی آیات اور سورتیں ایک مصحف میں مرتب کردیں۔

اسلامی حکومت کی حدود وسیع ہونے کے ساتھ مصاحف کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے بھی قرآن مجید کے مزید نسخوں کی ضرورت بڑھ گئی۔ یہ مصاحف اپنے مرتب کرنے والوں کی شخصیت و مقام کی وجہ سے خاص اہمیت کے حامل ٹھہرے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے بزرگ صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ کا مصحف، اہل کوفہ کے لیے مرجع شمار ہوتا تھا جبکہ مصحفِ اُبی بن کعب مدینہ والوں کے لیے، مصحفِ ابوموسیٰ اشعری بصرہ والوں کے لیے اور مصحفِ مقداد بن اسود شام والوں کے لیے توجہ کا مرکز تھا۔

اختلافِ مصاحف

چونکہ مصاحف مرتب کرنے والے افراد متعدد تھے اور اس بارے میں ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ افراد یہ کام انجام دینے میں اہلیت، استعداد اور صلاحیت کے لحاظ سے بھی یکساں نہیں تھے۔ اسی لیے ہر کسی کا نسخہ روش، ترتیب، قرائت وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ مصاحف اور قرائت میں اختلاف پایا جانا لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہونے کا سبب تھا۔ بعض اوقات دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمان جو جنگ یا دوسری مناسبتوں سے اکٹھے ہوتے تھے اپنے عقیدے اور تعصب کی بناء پر ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے اور اکثر اُن میں لڑائی جھگڑا ہو جاتا تھا۔

مصاحف پر لوگوں کے اختلافات عام تھے اور صاحبانِ مصاحف اپنی قرائتوں پر تعصب برتتے تھے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

ا۔ سرزمین ارمنستان کی جنگ سے واپسی کے موقع پر حذیفہ نے سعید بن عاص سے کہا: اس سفر میں ایک ایسا مسئلہ پیش آیا

ہے کہ اگر اس سے چشم پوشی کی گئی تو قرآن مجید میں لوگوں کے اختلاف کا سبب بنے گا اور کبھی اسے حل نہیں کیا جا سکے گا۔ سعید نے پوچھا: کیا مسئلہ ہے؟ حذیفہ نے کہا: میں نے حمص (شام کا ایک شہر ہے) کے لوگوں کو دیکھا ہے جن کا خیال ہے کہ ان کی قرائت دوسری تمام قرائتوں سے بہتر ہے اور انہوں نے قرائت قرآن کو مقداد بن اسود سے سیکھا ہے۔ اہل دمشق کو یہ کہتے سنا کہ ہماری قرائت دوسری قرائتوں سے بہتر ہے۔ اسی طرح اہل کوفہ نے ابن مسعود کی قرائت اپنائی ہوئی تھی اور اس بارے میں ان کی نظر بھی یہی تھی۔ اسی لیے اہل بصرہ ابو موسیٰ اشعری کی قرائت کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں اور اس مصحف کا نام ''لُباب القلوب'' رکھا ہوا ہے۔

جب حذیفہ اور سعید کوفہ پہنچے تو حذیفہ نے یہ موضوع لوگوں سے بیان کیا اور انہیں اس کے خطرناک انجام سے خبردار کیا۔ صحابہ کرامؓ اور بہت سے تابعین نے اس بات کی تائید کی۔ لیکن ابن مسعود کے چاہنے والوں نے اس پر اعتراض کیا کہ اس میں کیا اعتراض ہے کہ ہم ابن مسعود کی قرائت کے مطابق تلاوت کرتے ہیں؟ حذیفہ اور اس کے طرفدار غصہ میں آ گئے اور انہیں کہا: چپ رہو! کیونکہ تم نے صحیح راستہ نہیں اپنایا۔ حذیفہ نے کہا: خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو یہ بات خلیفہ (حضرت عثمانؓ) کو ضرور بتاؤں گا تاکہ وہ اس کا کوئی حل تلاش کریں۔ حذیفہ نے ابن مسعود سے ملاقات کے دوران یہ بات ان سے بھی کہی۔ لیکن ابن مسعود، حذیفہ کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ سعید سخت ناراضگی میں محفل سے نکل گئے اور سب لوگ منتشر ہو گئے اور حذیفہ غصے میں حضرت عثمانؓ سے ملاقات کے لیے چل پڑے۔[1]

۲۔ یزید نخعی کہتے ہیں: جب ولید بن عقبہ حضرت عثمانؓ کی جانب سے کوفہ کا گورنر تھا تو میں مسجد کوفہ گیا وہاں لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان حذیفہ بھی تھے۔ اس وقت مسجد کا کوئی متولی نہیں تھا۔ کسی نے بلند آواز میں کہا! جو ابو موسیٰ اشعری کی قرائت کے پیرو ہیں وہ دروازے والے کونے میں اور جو ابن مسعود کی قرائت کے پیرو ہیں وہ عبداللہ کے گھر کے نزدیکی کونے میں آ جائیں۔ دونوں گروہوں کا سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۶ کے متعلق اختلاف تھا۔ ایک گروہ کہتا تھا ''وَ أَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلْبَيْت'' اور دوسرا کہتا تھا ''وَ أَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ''[2] حذیفہ سخت ناراض ہوئے اور کہا: اس طرح کے اختلافات تم سے پہلے بھی پائے جاتے تھے اور پھر اُس نے حضرت عثمانؓ سے ملاقات کرنے کے موضوع کو بیان کیا۔

۳۔ ابن اشتہ نے انس بن مالک سے روایت کی ہے: عہد عثمانؓ میں لوگوں کے درمیان قرائتِ قرآن پر اختلاف پایا جاتا تھا۔ اگر ایک استاد کسی ایک صاحبِ مصحف کی قرائت پر قرآن کی تعلیم دیتا تو دوسرا کسی دوسرے صاحب مصحف کی قرائت پر۔ یہی بات نوجوانوں کے باہمی اختلاف کا سبب بنتی تھی۔ حتیٰ استادوں کے درمیان بھی اختلافات پائے جاتے تھے اور ہر استاد دوسرے کی قرائت غلط سمجھتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے کہا: تم لوگ یہاں (مدینہ) میں ہوتے ہوئے قرآن کے متعلق اختلاف کرتے ہو اور اسے غلط پڑھتے ہو، تو پھر جو دور دراز کے لوگ ہیں وہ تو اس میں تم سے زیادہ

---

۱) الکامل فی التاریخ؛ ج ۳، ص ۱۱۱

۲) سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۶

اختلاف کریں گے۔ ا

اگر حذیفہ بن یمان جیسے آگاہ اور دور اندیش افراد کی طرف سے قرائتِ قرآن پر موجود اختلافات کی نشاندھی اور اس کے بھیانک نتائج کی پیش بینی نہ ہوتی تو نہ جانے یہ مسئلہ کتنے ناخوشگوار واقعات اور فتنوں کو جنم دیتا۔

حذیفہ کا مدینہ پہنچنا

جب حذیفہ ارمنستان کی جنگ سے واپس پلٹے تو قرائتِ قرآن سے متعلق لوگوں کے باہمی اختلاف سے ناخوش تھے لہٰذا اس سے پہلے کہ یہ مشکل دوسری جگہ پھیلے، اس کے راہ حل پر کوفہ میں موجود صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ حذیفہ معتقد تھے کہ حضرت عثمانؓ کو مصاحف یکساں کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے اور وہ لوگوں کو صرف ایک ہی قرائت کا حکم دیں۔ عبداللہ بن مسعود کے علاوہ باقی تمام صحابہ نے اس بات کے صحیح ہونے پر اتفاق کیا۔ لہٰذا حذیفہ نے جتنی جلدی ممکن تھا مدینہ کی طرف سفر کیا تاکہ حضرت عثمانؓ کو اس بات پر آمادہ کریں اور امتِ محمدیؐ انتشار سے بچ جائے۔

حذیفہ نے حضرت عثمانؓ سے کہا: اے خلیفۂ مسلمین! میں بغیر کسی جھجھک اور لگی لپٹی کے خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس امت کا خیال کیجئے۔ مبادا وہ بھی اُسی اختلاف کا شکار ہو جائے جس کا یہود و نصاریٰ شکار ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ حذیفہ نے کہا: جب میں ارمنستان کی جنگ میں شریک تھا وہاں شام کے لوگ قرآن کو ابی ابن کعب کی قرائت پر تلاوت کرتے تھے کہ جن میں سے بعض موارد ایسے تھے جنہیں قبلاً اہل عراق نے نہیں سنا تھا۔ عراق کے لوگ ابن مسعود کی قرائت کی پیروی کرتے تھے جبکہ اس کے بعض موارد سے اہل شام مطلع نہیں تھے اور ہر گروہ دوسرے کی تکفیر پر تلا ہوا تھا۔ ۲

چونکہ ان واقعات کا انجام اچھا نہیں تھا اسی لیے حضرت عثمانؓ مصاحف یکساں کرنے کی سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت مصاحف کا یکساں کرنا ایک بہت بڑا کام تھا اور یہ ایک نئی بات تھی کیونکہ اسلاف میں سے کسی نے بھی ایسا کام انجام نہیں دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کام میں بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں درپیش تھیں کیونکہ ان مصاحف کے متعدد نسخے اسلامی سرزمین کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر ایک مصحف کو کسی نہ کسی بڑے صحابی کی پشت پناہی حاصل تھی۔

اس وقت کے اسلامی معاشرہ میں ان اکابر صحابہ کی شخصیت سے صرفِ نظر کرنا بہت دشوار تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے مصحف کی حمایت و دفاع میں قیام کریں اور اس کام میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ نے مدینہ منورہ میں موجود تمام صحابہ کرامؓ کو اکٹھا کر کے اس بارے میں مشورہ کیا۔ تمام صحابہ اس کام کو ہر قیمت پر انجام دینے کے لیے متفق تھے۔

ابن اثیر کہتے ہیں:

---

۱) الاتقان؛ ج ۱، ص ۵۹

۲) الکامل فی التاریخ؛ ج ۳، ص ۱۱۱ / صحیح بخاری؛ ج ۶، ص ۲۲۵ / مصاحف بجستانی؛ ص ۲۰ ـ ۱۹

حضرت عثمانؓ نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اصحاب کو اکٹھا کر کے یہ موضوع ان کے سامنے بیان کیا تو سب نے حذیفہ کے نظریے کی تائید کی۔[1]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے بھی اس اصولی پروگرام سے اپنی موافقت کا اظہار کیا۔ ابن ابی داود نے سوید بن غفلہ سے روایت کی ہے کہ علی علیہ السلام نے فرمایا:

''خدا کی قسم! حضرت عثمانؓ نے مصاحف کی جمع آوری کے سلسلے میں کوئی بھی کام ہمارے مشورے کے بغیر انجام نہیں دیا۔ انہوں نے قرائتوں کے بارے میں ہم سے مشورہ کیا اور کہا: مجھے بتلایا گیا ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری قرائت تمھاری قرائت سے بہتر ہے اور یہ چیز کفر کے زیادہ نزدیک ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: میری نظر میں لوگوں کے پاس صرف ایک مصحف ہونا چاہیے تا کہ اس بارے میں اختلاف کا شکار نہ ہوں۔ میں نے کہا: بہت اچھی رائے ہے''۔[2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

''اگر مصاحف کی ذمہ داری مجھے سونپی جاتی تو میں بھی وہی کرتا جو عثمانؓ نے انجام دیا ہے''۔[3]

سوالات

۱۔ کوفہ، مدینہ، بصرہ اور شام میں کن کا مصحف لوگوں میں رائج تھا؟

۲۔ صحابہ کرامؓ کے صحیفوں میں اختلاف کی وجہ کیا تھی اور یہ اختلاف کن موارد میں تھا؟

۳۔ صحیفوں میں اختلافات کا پایا جانا کن مشکلات کا باعث بنا؟

۴۔ حضرت عثمانؓ نے صحیفے یکساں کرنے کے متعلق کیوں سوچا؟

۵۔ عہدِ عثمانؓ میں صحیفے یکساں کیے جانے کے بارے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی کیا رائے تھی؟

---

[1] الکامل فی التاریخ؛ ج ۳، ص ۱۱۱

[2] الاتقان؛ ج ۱، ص ۵۹

[3] النشر فی القراءات العشر؛ ج ۱، ص ۸

دسواں سبق

اتحادِ مصاحف

اتحادمصاحف کمیٹی

حضرت عثمانؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ مصاحف متحد اور یکساں کرنے کا اقدام کیا اور پیغمبر اکرمﷺ کے اصحاب سے اپنے عمومی پیغام کے ذریعہ مدد مانگی۔[1] پھر اپنے ان چار خاص افراد زید بن ثابت (انصار میں سے)، سعید بن عاص، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشام (جو قریش میں سے تھے) کو اس کام کے اجراء کے لیے انتخاب کیا۔ یہ چار افراد اتحاد مصاحف کمیٹی کے پہلے اراکین شمار کیے جاتے ہیں ان کے سربراہ زید بن ثابت تھے۔[2]

پھر حضرت عثمانؓ نے خود ان چار افراد کی سربراہی کی ذمہ داری سنبھالی۔ لیکن وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے کیونکہ یہ انتہائی اہم کام انجام دینے کے لیے اس کے ماہرین کی ضرورت تھی۔ شروع میں حضرت عثمانؓ کا خیال تھا کہ مصاحف یکساں کرنا آسان کام ہے لہٰذا ایک ایسا گروہ تشکیل دیا جو یہ کام انجام دینے کا زیادہ اہل نہیں تھا۔ آخرکار انہیں لائق، باصلاحیت اور ماہر افراد پر مشتمل ایک دوسرا گروہ تشکیل دینا پڑا۔ جس میں سید القراء بزرگ صحابی ابی ابن کعب جیسے افراد بھی موجود تھے۔[3] لہٰذا اُبی ابن کعب، مالک بن ابی عامر، کثیر بن افلح، انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، مصعب بن سعد، عبداللہ بن فطیمہ ابن سیرین اور ابن سعد اور بعض دوسروں کی روایت کے مطابق ان مذکورہ سات افراد کے علاوہ پانچ دوسرے افراد سے بھی مدد لی گئی۔ مجموعی طور پر یہ ۱۲ افراد تھے اس گروہ کے سربراہ ابی ابن کعب تھے۔

ابوالعالیہ اس بارے میں کہتے ہیں: انہوں نے قرآن کو مصحفِ اُبی ابن کعب سے جمع کیا ہے۔ اُبی ابن کعب خود املاء کرواتے تھے اور باقی افراد لکھتے تھے۔[4]

---

۱) الاتقان؛ ج۱؛ ص۵۹/ مصاحف بجستانی؛ ص۲۱
۲) صحیح بخاری؛ ج۶؛ ص۲۲۶
۳) تہذیب التہذیب؛ ج۲؛ ص۱۸۷
۴) مصاحف بجستانی؛ ص۳۰

اتحادِ مصاحف کے مراحل

اتحادِ مصاحف کمیٹی نے اپنی ذمہ داری انجام دینے کے لیے درج ذیل تین بنیادی مراحل طے کیے۔

ا۔صحیح منابع و ماخذ کی جمع آوری، منابع کو ایک دوسرے کے ساتھ پرکھنا اور ایک ہی مصحف کی تیاری۔

۲۔تیار شدہ مصاحف کے صحیح ہونے اور عدمِ اختلاف کی غرض سے باہمی تقابل۔

۳۔تمام اسلامی شہروں سے مختلف مصاحف جمع کر کے انہیں ضائع کرنا اور جدید مصحف کو منتشر کرنا، اور تمام مسلمانوں کو اسکی قرائت پر پابند بنانا اور دوسرے مصاحف کی قرائتوں سے منع کرنا۔

پہلے مرحلے میں حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کیلیئے اعلان کیا کہ جس نے پیغمبر اکرم ﷺ سے جتنا بھی قرآن سنا ہے اسے اتحادِ مصاحف کمیٹی کے حوالے کرے۔اس اعلان کی بنا پر سب لوگ ان تختیوں، ہڈیوں اور لکڑیوں کو اٹھا لے آئے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا۔حضرت عثمانؓ نے حفصہ سے بھی ان صحیفوں کو مانگا جو حضرت ابوبکرؓ کے دور میں تیار ہوئے۔ابتداء میں حفصہ صحیفوں کے ضائع ہونے کے ڈر سے انکار کر رہی تھیں۔حضرت عثمانؓ نے وہ صحیفے پلٹانے کا وعدہ کیا۔تو حفصہ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے حوالے کر دیے تاکہ مختلف مصاحف کے باہمی تقابل اور متعدد نسخوں کی تیاری میں یہ مصحف ایک قابل اعتماد اور پایدار دستاویز قرار پائے۔[1]

انس بن مالک کہتے ہیں:

میں بھی ان افراد میں شامل تھا جو کاتبین کو املاء کرواتے تھے۔بعض اوقات جب کسی آیت پر اختلاف ہوتا تو اس صورت میں ان افراد کی رائے لی جاتی جنہوں نے اس آیت کو پیغمبر اکرم ﷺ سے سنا ہوتا تھا۔ایسے افراد اگر مدینہ میں موجود نہ ہوتے تھے تو اس آیت کو سیاق و سباق سمیت لکھ بھیجتے تھے اور ان سے چاہتے تھے کہ موردِ اختلاف حصہ جسے انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سنا ہے ان کے لیے لکھ بھیجیں یا خود لیکر حاضر ہوں۔[2] موردِ اختلاف آیات اُبی ابن کعب کے پاس بھیجتے تھے اور وہ تصحیح کے بعد پلٹا دیا کرتے تھے۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

جب کسی آیت پر اختلاف ہوتا تو اسے درج کرنے میں تاخیر کر دیتے تھے۔بعض نے کہا ہے کہ اختلافی آیات ثبت کرنے میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ ان افراد کے نسخے حاصل کریں جو اس وقت موجود تھے جب آخری مرتبہ رسول پاکؐ پر قرآن پیش ہوا۔[3]

عبداللہ بن ہانی بربری (حضرت عثمانؓ کے غلام) بھی نقل کرتے ہیں:

میں اس وقت حضرت عثمانؓ کے پاس تھا جب وہ مصاحف کے مختلف نسخوں کا تقابل کیا کرتے تھے حضرت عثمانؓ نے ایک

---

[1] مصاحف سجستانی؛ص۹ صحیح بخاری؛ ج۶،ص۲۲۶

[2] مصاحف سجستانی؛ص۲۱

[3] مصاحف سجستانی؛ص۲۵

بھیڑ کی ران کی ہڈی مجھے دی جس پر یہ کلمات لکھے ہوئے تھے: "لم یتسن، لا تبدیل للخلق اللہ اور فأمھل الکافرین" میں اسے ابی ابن کعب کے پاس لے گیا اُس نے ان کی یوں تصحیح کی "لَم یَتَسَنَه[1]، لاَتَبدِیلَ لِخَلقِ اللہ[2] اور فَمَهِّلِ الکافِرِینَ[3]"[4]

دوسرے مرحلے یعنی جدید مصاحف کو ایک دوسرے کے ساتھ پرکھنے کے مرحلہ میں بڑی سستی اور بے توجہی سے کام لیا گیا۔ جس کی وجہ سے مصاحفِ عثمانی میں واضح اشتباہات اور املائی غلطیاں پائی جاتی تھیں۔

ابن ابی داوٗد نقل کرتے ہیں:

جب مصاحف کے متعدد نسخے تیار ہو گئے تو ان میں سے ایک نسخہ حضرت عثمانؓ کو پیش کیا گیا۔ انہوں نے دیکھا اور کہا: کتنا بہتر اور خوبصورت تیار کیا ہے۔ لیکن جب اس میں غلطیاں دیکھیں تو کہا: اگر املاء کرانے والا قبیلہ "ہذیل" سے اور لکھنے والا قبیلہ "ثقیف" سے ہوتا تو یہ غلطیاں نہ ہوتیں اور پھر کہا: لیکن عرب اپنی مادری زبان کے مطابق اسے صحیح طرح پڑھ لیں گے۔[5]

تیسرے مرحلے (یعنی مصاحف جمع کر کے انہیں ضائع کرنے) میں حضرت عثمانؓ نے مختلف شہروں میں اپنے افراد بھیج کر ان کے ذریعے تمام صحیفے اکٹھے کر کے جلانے کا حکم دیا۔[6]

ابن واضح یعقوبی کہتے ہیں:

اسلامی مملکت کے گوشہ و کنار سے تمام مصاحف اکٹھے کیے گئے اور پھر انہیں سرکہ اور پانی میں ڈال کر اُبالا اور دھوڈالا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے: یہ مصاحف جلا دیئے گئے۔ صرف مصحفِ ابن مسعود محفوظ رہا کیونکہ انہوں نے اپنا مصحف کوفہ کے گورنر عبداللہ بن عامر کے حوالے نہیں کیا تھا۔[7]

مصاحفِ عثمانی کی تعداد

مختلف اسلامی مراکز میں بھیجے گئے جدید عثمانی صحیفوں کی تعداد میں مورخین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

ابن ابی داوٗد کے نزدیک ان کی تعداد چھ (۶) تھی۔ ہر ایک نسخہ اس وقت کے کسی ایک اہم اسلامی مرکز میں بھیجا گیا وہ چھ مراکز مکہ، کوفہ، بصرہ، شام، بحرین اور یمن ہیں۔

---

[1] سورۂ بقرہ / آیت ۲۵۹

[2] سورۂ روم / آیت ۳۰

[3] سورۂ طارق / آیت ۱۷

[4] الاتقان؛ ج ۱، ص ۱۸۳

[5] مصاحف بجستانی؛ ص ۳۳۔۳۲

[6] صحیح بخاری، ج ۶، ص ۲۲۶

[7] تاریخ یعقوبی؛ ص ۱۶۰۔۱۵۹

ابن ابی داؤد مزید کہتے ہیں:

ان چھ نسخوں کے علاوہ ایک نسخہ مدینہ میں رکھا گیا جسے ''امّ یا امام'' کہتے تھے۔[۱]

یعقوبی کہتے ہیں:

ان مذکورہ نسخوں کے علاوہ دو نسخے اور بھی تھے جنہیں مصر اور الجزیرہ میں بھیجا گیا۔[۲]

جس علاقہ میں بھی مصحف بھیجا گیا وہیں اس کی حفاظت ہوتی اور لوگوں کے لیے اس سے مزید نسخے تیار کیے جاتے تھے۔ صرف انہی مصاحف کی قرائت رسمی اور قانونی تھی۔ اگر کوئی نسخہ یا قرائت ان جدید مصاحف کے برخلاف ہوتی تو ممنوع اور غیر قانونی سمجھی جاتی تھی اور ان پر عمل پیرا سزا کا مستحق تھا۔ مصحفِ مدینہ تمام مصاحف کا مرجع تھا۔ دوسرے شہروں میں بھیجے گئے مصاحف میں اختلاف رونما ہونے کی صورت میں اس اختلاف کو ختم کرنے اور اس کی تصحیح کے لیے مصحفِ مدینہ معیار قرار دیا جاتا تھا اور دوسرے مصاحف کی تصحیح مصحف مدینہ کے مطابق ہوتی تھی۔

کہا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سب شہروں میں ہر مصحف کے ساتھ ایک قاری قرآن بھی بھیجا تا کہ وہاں کے لوگوں کو اس مصحف کے مطابق قرآن کی تعلیم دے۔ ان میں عبداللہ بن صائب مصحفِ مکہ کیساتھ مغیرہ بن شہاب مصحفِ شام کے ہمراہ ابو عبدالرحمن سلمی مصحفِ کوفہ کیساتھ اور عامر بن عبدالقیس مصحفِ بصرہ کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ اسی طرح بعض دوسرے افراد دیگر شہروں میں بھی بھیجے گئے۔ زید بن ثابت خلیفہ کی جانب سے قاری مدینہ متعین ہوئے۔[۳]

مصاحفِ عثمانی کی خصوصیات

۱۔ ترتیب

مصحفِ عثمانی میں سورتوں کی ترتیب موجودہ قرآن ہی کی طرح ہے۔ جو مصاحفِ صحابہ میں پائی جانیوالی ترتیب (بالخصوص مصحفِ ابی بن کعب) کے مطابق تھی۔ البتہ چند موارد میں مطابقت نہیں ہے۔

۲۔ نقطہ اور علامت

اس زمانہ میں عربوں کے درمیان رائج شیوہ نگارش کے مطابق مصحف عثمانی ہر طرح کے نقطہ اور علامت سے خالی تھے نقطہ دار حروف کو بغیر نقط حروف سے الگ پہچاننا مشکل تھا۔ لہٰذا ''ب'' اور ''ت''، ''ی'' اور ''ث'' میں کوئی فرق نہیں تھا اور ''ج، ح اور خ'' کو ایک دوسرے سے تشخیص نہیں دی جاسکتی تھی۔ اسی طرح کلمات کے اعراب اور حرکات کو زبر، زیر، پیش اور تنوین سے ظاہر نہیں

---

[۱] مصاحف سجستانی، ص ۳۴

[۲] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۶۰

[۳] مناہل العرفان: ج ۱، ص ۳۹۷-۳۹۶

کیا جاتا تھا۔ یہ پڑھنے والے کی ذمہ داری تھی کہ وہ قرائت اور تلاوت کے دوران قرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے حروف کو ایک دوسرے سے جدا کرے اور اس کلمہ کے وزن اور اس کے اعراب کو ذاتی طور پر جانتا ہو۔ اسی وجہ سے صدرِ اسلام میں قرائت قرآن صرف سماع اور نقل پر موقوف تھی اور سماع کے علاوہ قرائت قرآن تقریباً ناممکن تھی۔

بہر حال مصاحف کا علامتوں اور نشانیوں سے خالی ہونا بعد والے زمانوں میں قرآن میں اختلاف کے پیدا ہونے کا سب سے اہم سبب بنا۔ کیونکہ لوگ فقط قرآن مجید کو سنتے اور اسے حفظ کرنے پر اکتفاء کرتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آیت کے سننے یا نقل کرنے میں اشتباہات اور غلطیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جزیرۃ العرب میں غیر عرب قوموں کے نفوذ اسلامی مملکت کی توسیع، ان کی تعداد اور آبادی میں خاطر خواہ اضافہ بھی اختلافِ قرائت کا سبب بنا۔

۳۔ رسم الخط میں نقائص

مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط کا دوسرے عمومی اور رائج رسم الخط سے مقایسہ کیا جائے تو عثمانی رسم الخط میں بہت سی املائی غلطیاں تھیں کلمات کے لکھنے کے انداز میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا تھا۔ اگر قرآن سماع و قرائت میں تواتر کیساتھ لکھا ہوا نہ ہوتا اور مسلمان اس روش کو اپنے اسلاف سے ارث میں نہ پاتے اور اپنی پوری توجہ کے ساتھ اسے حفظ نہ کرتے تو آج بہت سے کلمات صحیح معنی میں قرائت کرنا محال ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب اس زمانہ میں فنونِ خط اور اسلوبِ نگارش سے ناآشنا تھے۔

مصاحفِ عثمانی کا انجام

ان مصاحف کی حفاظت پر حکومتی کارندوں اور خلیفہ کے افراد کی خصوصی توجہ تھی۔ علاوہ ازیں لوگوں کی خاص دلچسپی بھی ان کی بقاء و دوام کا سبب بنی۔ ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد ان مصاحف میں رفتہ رفتہ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جن میں سے نقطہ گذاری، علامت گذاری، منزل، ربع اور حزب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بالآخر ان مصاحف کا رسم الخط بھی ابتدائی کوفی خط سے جدید کوفی خط میں تبدیل ہو گیا۔ بعد کے زمانوں میں قرآن کریم کی کتابت نے عربی زبان کے خوبصورت رسم الخط ''نسخ'' اور دوسرے رائج رسم الخطوں میں رواج پایا۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے عہدِ عثمانؓ میں لکھے جانے والے ابتدائی مصاحف کو بتدریج بھلا دیا گیا اور آہستہ آہستہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) کہتے ہیں: عثمان بن عفان کے ہاتھ سے لکھا ہوا مصحف مسجد دمشق میں موجود ہے۔ [۱]

اس مصحف کو فضل اللہ عمری (متوفی ۷۴۹ھ) نے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں:

خود عثمان بن عفان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصحف مسجد دمشق میں بائیں طرف ابھی تک باقی ہے۔ [۲]

۱) معجم البلدان؛ ج ۲ ص ۴۶۹

۲) مسالک الابصار فی ممالک الامصار؛ ج ۱ ص ۱۹۵

مشہور سیاح ابن بطوطہ (متوفی ۷۷۹ھ) کہتے ہیں:

مسجد دمشق کے مشرقی ستون میں محراب کے مدمقابل ایک بڑا اسٹور ہے جس میں اس مصحف کی حفاظت کی گئی ہے جسے عثمان بن عفان نے شام بھیجا تھا۔ اس اسٹور کو ہر جمعہ کی نماز کے بعد کھولتے ہیں۔ مصحف کو چومنے کے لیے لوگوں کا ہجوم لگ جاتا ہے اور اسی جگہ لوگ اپنے اختلاف، جھگڑوں اور دعوؤں کے بارے میں ایک دوسرے سے قسم لیتے ہیں۔[1] کہا گیا ہے کہ یہ مصحف اسی طرح مسجد دمشق میں موجود تھا یہاں تک کہ سال ۱۳۱۰ھ میں نذر آتش ہو گیا۔[2]

حرمِ امام حسین علیہ السلام کے میوزیم میں قدیم کوفی خط میں لکھا ہوا عثمان سے منسوب ایک مصحف موجود ہے۔ جس کے حروف میں کسی طرح کی کوئی علامت ونشانی نہ پائے جانے اور اس کے ضخیم ہونے کی وجہ سے یہ مصحفِ مدینہ یا مصحفِ شام کی مانند ہے۔ بالخصوص اس مصحف میں کلمہ ''یَرْتَدَّ ''[3] کو ''یر تدد'' لکھا گیا ہے۔ زیادہ قوی احتمال یہ ہے کہ اس مصحف کی مصاحف عثمانی سے نسخہ برداری کی گئی ہے۔[4]

رائج قرآن کی حفاظت سے متعلق آئمہ علیہم السلام کا موقف

جب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام منصب خلافت پر فائز ہوئے تو مصاحف عثمانی میں کتابت کی غلطیوں کے باوجود لوگوں کو انہی مصاحف کا پابند رہنے کا حکم دیا تا کہ وہ اس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ امام علی علیہ السلام نے یہ حکم اس لیے صادر کیا تا کہ کوئی قرآن کریم کی اصلاح کا بہانہ بنا کر اس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی اور تحریف نہ کرنے پائے۔ اسی لیے امام علیؑ نے تاکید فرمائی کہ آج کے بعد کوئی بھی قرآن کریم میں تبدیلی نہ کرے اور خود آپ علیہ السلام نے ہی ''**ان القرآن لایهاج الیوم ولایحول**'' کا قاطعانہ حکم صادر فرمایا۔[5]

کسی شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں قرآن مجید سے کچھ آیات لوگوں میں رائج قرائت کے برخلاف پڑھیں تو امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

''دوبارہ اس طرح قرائت نہ کرنا اور ویسے ہی قرائت کرو جیسے سب لوگ قرائت کرتے ہیں''۔

اس طرح جب کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ سوال کیا کہ قرآن کی تلاوت کیسے کریں؟

تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] رحلۂ ابن بطوطہ؛ ج ۱، ص ۵۴

[2] الخطط؛ ج ۵، ص ۲۷۹

[3] سورہ مائدہ/ آیت ۵۴

[4] مناھل العرفان؛ ج ۱، ص ۳۹۸-۳۹۷

[5] تفسیر طبری؛ ج ۲۷، ص ۱۰۴/ تفسیر مجمع البیان؛ ج ۹، ص ۲۸۱

''جیساتم نے قرآن سیکھا ہے ویسے ہی تلاوت کرو'' یعنی سب مسلمانوں کی قرائت کے مطابق ۔[۱]

لہٰذا شیعہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ موجودہ قرآن جامع اور کامل ہے[۲] مزید مسلمانوں کے درمیان رائج قرائت (حفص کی قرائت) ہی صحیح اور درست قرائت ہے۔جس کا نماز میں پڑھنا درست ہے اور تمام موارد میں اس موجودہ نص سے استفادہ کرنا صحیح ہے۔

سوالات

۱۔صحیفوں کے اتحاد کی کمیٹی کیسے وجود میں آئی اور کن افراد پر مشتمل تھی؟

۲۔عہدِ عثمانؓ میں اتحادِ مصاحف کے اتحاد کے مراحل بیان کریں؟

۳۔مصاحفِ عثمانی میں سورتوں کی ترتیب کیسی تھی؟

۴۔مصاحفِ عثمانی کی کتابت میں پائے جانے والے کوئی سے دو نقائص بیان کریں؟

۵۔مصاحفِ عثمانی کا انجام کیا ہوا؟

۶۔امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے دورِ خلافت میں مصاحفِ عثمانی کے متعلق کیا مؤقف اختیار کیا؟

۱) وسائل الشیعہ: ج ۴، ابواب قراءۃ القرآن

۲) بحارالانوار: ج ۹۲ ص ۴۲۔۴۱

قرائت اور قاریانِ قرآن

قرآن کریم کی قرائت وتلاوت قرآن مجید کے اہم مسائل میں سے ہے۔

صدرِ اسلام ہی سے بعض افراد نے اسلامی معاشرہ میں قرائت اور تعلیمِ قرآن کی ذمہ داری سنبھالے رکھی ہے۔

پوری تاریخ میں قرآن کریم کے قاریوں کو چندگروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو طبقاتِ قراء کے نام سے مشہور ہیں۔جن میں سے چند طبقات یہ ہیں۔

پہلا طبقہ: اس میں بزرگ صحابہ کرام عبداللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، ابوالدرداءؓ اور زید بن ثابتؓ ہیں۔ان صحابہ کرامؓ نے براہ راست رسولِ اکرمؐ سے قرائت سیکھی اور مشہور ہو گئے۔

دوسرا طبقہ: اس میں بزرگ صحابہ کرام عبداللہ بن عباس، ابوالاسود دوئلی، علقمہ بن قیس، عبداللہ بن سائب، اسود بن یزید، ابوعبدالرحمان سُلمی اور مسروق بن اجدع وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔اس کے بعد تیسرے طبقے سے لے کر آٹھویں طبقے تک دوسری بڑی شخصیات ہیں۔قاریوں کے ان طبقات کے بعد قرائتوں کی تدوین کا آغاز ہوا اور پھر اسی کے ضمن میں قراء سبعہ (سات قاری) معین ہوئے۔

قرآن مجید کے مشہور قاریوں اور قرائتوں کا یہ سلسلہ صدی بہ صدی آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ چوتھی صدی کے آغاز میں بغداد کے شیخ القرّاء ابوبکر بن مجاہد (۲۴۵۔ ۳۲۴ھ) نے مختلف قرائتوں میں سے سات مشہور قاریوں کی قرائتوں کو رسمی طور پر قبول کیا۔بعدازاں مختلف ادوار میں مزید سات قاریوں کا اضافہ ہوا اس طرح چودہ (۱۴) قرائتیں مشہور ہوگئیں۔ان میں سے ہر قرائت دو راویوں سے نقل ہوئی ہے اس طرح مجموعی طور پر رائج قرائتوں کی تعداد اٹھائیس (۲۸) ہے۔

قرائتوں کی حجیت اور ان کے صحیح ہونے بارے میں بہت زیادہ بحث ہوئی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کیا یہ سب بطور متواتر پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہیں یا نہیں؟ مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ قرائتیں متواتر نہیں ہیں۔ محققین کی نظر میں پیغمبر اکرم ﷺ سے صرف ایک قرائت نقل ہوئی ہے اور یہ قرائت وہی ہے جو مسلمانوں کے درمیان رائج ہے۔[1]

---

[1] التمہید؛ ج ۲، ص ۴۲ کے بعد نیز ۲۲۶۔ 218

قرائت کی تعریف

قرائت یعنی قرآن کریم کو پڑھنا اور تلاوت کرنا ہے اور اصطلاحی طور پر مشہور قاریوں کی اجتہادی رائے کے مطابق بیان کردہ صفات پر وحی الٰہی کی تلاوت کرنا ایسی تلاوت جو علم قرائت کے مشخص اور معین اصولوں کے مطابق ہو۔

قرآن مجید کی صرف ایک نص ہے اور قاریوں کے اختلافات اسی ایک نص کے حاصل کرنے میں ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ان القرآن واحد نزل من عند واحد ولکن الاختلاف یجیء من قبل الرواۃ؛ بیشک قرآن کریم ایک ہے اور ایک خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے لیکن اس (قرآن) میں اختلاف اس کے راویوں (قاریوں) کی وجہ سے پیدا ہوا ہے''۔[1]

قرائتوں میں اختلاف کے اسباب

قرائت میں اختلاف کا سبب بننے والے عوامل کی ابتداء پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد عصرِ صحابہ میں ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرامؓ کے درمیان قرآن کریم کی ترتیب وتدوین میں اختلاف تھا۔ بعض اوقات قرائت قرآن کے متعلق ان کا یہ باہمی اختلاف قاریوں کے درمیان بھی اختلاف کا سبب بنا۔ یہ اختلاف اتنا شدید تھا کہ عہد عثمان میں یہ طے پایا کہ ایک مصحف تیار کیا جائے اور پھر اس سے مزید کئی نسخے تیار کر کے اسلامی مملکت کے اہم مراکز میں بھیجے جائیں۔ اگرچہ ان نسخوں کو آپس میں ہو بہو ایک جیسا اور یکساں ہونا چاہیے تھا لیکن ان میں اس قدر کمی رہ گئی جو بعد میں قرائت قرآن میں اختلاف کا باعث بنی۔ ان میں سے بعض اختلافات درج ذیل ہیں۔

۱۔ عربی رسم الخط کا ابتدائی ہونا

اس وقت عرب معاشرے میں رسم الخط اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ کتابت کے اصول وقوانین استوار نہیں ہوئے تھے۔ عرب لوگ فن رسم الخط سے آشنا نہیں تھے اور صحیح طرح سے لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ بہت سے کلمات تلفظ کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ آج اُس رسم الخط کا کوئی مکتوب اثاثہ موجود نہیں ہے۔ اس رسم الخط میں کلمات ایسے لکھتے کہ انہیں مختلف صورتوں میں پڑھا جا سکتا تھا۔ لفظ کے آخر میں ''ن'' ایسے لکھتے تھے کہ ''ز'' سے کوئی فرق نہ تھا ''و'' اور ''ی'' کی شکل بھی ایک جیسی تھی۔ کبھی لفظ کے آخر میں ''م'' ''و'' اور ''د'' کو ''کوفی کاف'' اور لفظ کے درمیان واقع ہونے والی ''ع'' کو ''ھ'' کی شکل میں لکھتے تھے۔ کبھی ایک ہی لفظ کے حروف ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے لکھتے تھے اور ''ی'' کو لفظ سے جدا کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر (یستحی ی)، (نحی ی)، (احی ی) یا ''ی'' کو حذف کر دیتے تھے۔ جیسا کہ لفظ (ایلافھم) کو (الافھم) لکھا جاتا تھا، جو پڑھنے والے کے لیے مشکل کا باعث تھا۔

---

[1] اصول کافی؛ ج ۲، ص ۶۳۰، حدیث ۱۲

اس دور کے ابتدائی رسم الخط میں ''واؤ اور یا'' بغیر کسی وجہ کے حذف کر دیے جاتے اور یہ بات قرائت وتفسیر میں ابہام اور اختلاف کے اہم ترین اسباب میں سے ہے۔ بطورِ مثال، آیت ''وصالِحُوا الْمُومِنِین'' [1] میں ''صالحوا'' سے واو کو حذف کر کے ''وصالح المومنین'' لکھا گیا ہے۔ لہذا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کلمہ مفرد ہے یا جمع مضاف ہے۔ خلاصہ یہ کہ شروع کے صحیفوں میں رسم الخط کے ان نقائص کی وجہ سے بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں۔

۲۔ حروف کا نقطوں کے بغیر ہونا

قرائت قرآن میں مشکلات پیدا کرنے والے اسباب وعوامل میں سے ایک اہم سبب حروف معجمہ (نقطہ دار حروف) کا نقطوں کے بغیر ہونا اور ان کا حروف مہملہ (بغیر نقطوں کے حروف) سے علیحدہ مشخص نہ ہونا ہے۔ لہذا ''س'' ''ش'' کے درمیان لکھنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اسی طرح سے ''ب'' ''ت'' ''ث'' اور ''ج'' ''ح'' وغیرہ کے لکھنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پڑھنے والا خود سے جملہ کے معنیٰ اور کلام کی ترکیب میں دقتِ نظر کے بعد اس کی تشخیص دیتا تھا۔ ابن عامر اور کوفہ کے قاریوں نے ''نُنشِزُها'' [2] پڑھا ہے جبکہ دوسرے قاریوں نے اس آیت کو ''نُنشرُها'' پڑھا ہے۔

۳۔ کلمات کا علامت گذاری اور حرکات سے خالی ہونا

مصاحف اولیہ میں کلمات ہر طرح کے اعراب اور حرکات کے بغیر لکھے جاتے تھے۔ کلمے کی ''اعرابی اور بنائی'' حرکت مشخص نہیں تھی۔ لہذا غیر عرب قاری کیلئے کلمہ کے وزن اور حرکت کی تشخیص مشکل تھی۔ یہاں تک کہ عربی زبان سے آشنا کیلئے بھی کلمہ کی بناوٹ کی تشخیص دشوار تھی۔ مثال کے طور پر یہ معین نہیں تھا کہ کلمہ ''اعلم'' فعل امر ہے یا فعل مضارع متکلم، افعل التفضیل ہے یا باب افعال سے فعل ماضی۔

حمزہ اور کسائی نے آیت ''قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیءٍ قَدِیرٌ'' [3] میں لفظ (اعلم) کو فعل امر جبکہ دوسروں نے اسے فعل مضارع متکلم قرائت کیا ہے۔

۴۔ الفاظ کے درمیان الف کا نہ ہونا

اس دور کے رسم الخط میں الف کا نہ ہونا مشکل کھڑی کرنے والے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ کوفی رسم الخط، سریانی

---

[1] سورۂ تحریم / آیت ۴

[2] سورۂ بقرہ / آیت ۲۵۹

[3] سورۂ بقرہ / آیت ۲۵۹

رسم الخط سے لیا گیا ہے۔ خط سریانی میں لفظ کے درمیان الف کے لکھنے کا رواج نہیں تھا بلکہ اسے گرا دیتے تھے۔ کیونکہ شروع میں قرآن مجید کی نگارش خط کوفی میں ہوتی تھی لہذا لفظ ''سماوات'' کے درمیان والی الف لکھنے میں نہ آتی تھی لفظ ''سماوات'' کو ''سموت'' کی شکل میں لکھتے تھے۔ بعدازاں مشخص علامتیں وضع ہونے پر درمیان والی الف کو، چھوٹی الف کی علامت کلمہ کے اوپر لگا دیتے تھے جیسے ''سمٰوٰت''۔ الفاظ کے درمیان سے الف کا گرا دینا متعدد مقامات پر قرائت میں اختلاف کا سبب بنا۔ مثال کے طور پر نافع، ابوعمرو اور ابن کثیر نے آیت ''مَا یَخدَعُونَ''[1] کو ''مایخادعون'' قرائت کیا ہے۔

المختصر ایسے ہی عوامل قاریوں کے اختلاف کا سبب بنے اور ان میں سے ہر کسی نے اپنے اجتہاد اور من پسند دلیلوں کے مطابق اپنی قرائت کی توجیہ کی اور اسے دوسری قرائتوں سے بہتر و برتر سمجھا۔

مشہور قرائتوں کی تدوین

صدر اسلام میں مسلمان پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب سے جس طرح قرآن سنتے بالکل اسی طرح یاد کرتے اور پڑھتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد اپنے اپنے شہر کے تابعین اور بزرگ پیشواؤں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس دور میں مسلمانوں کا مرکز شمار ہونے والے اسلامی دانشوروں کا پہلا گروہ کسی ایک خاص علم (جیسے قرائت قرآن وغیرہ) ہی میں مہارت نہیں رکھتا تھا بلکہ ان کی پہچان عام طور پر اپنے زمانے کے مختلف اسلامی علوم کے عالم ہونے کے عنوان سے تھی۔ بعدازاں ایک گروہ نے قرائت قرآن کی تعلیم کو اپنا نصب العین بنایا اور اس فن میں خاص دلچسپی لیتے ہوئے بڑی شہرت حاصل کی۔ بنابرایں دور دراز سے لوگ قرآن کریم کی تعلیم لینے ان کے پاس آتے تھے۔ مختلف علاقوں میں یہی معمول تھا کہ ہر شہر کے لوگ صرف اپنے ہی شہر کے قاری سے قرآن کی تعلیم لیتے اور اسی کی قرائت کو قابل قبول سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ قاریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ اسلامی دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلتے چلے گئے۔ یوں قاریوں کے ہر طبقے کے بعد دوسرا طبقہ جانشین ہوجاتا تھا۔ قرآن کریم سیکھنے اور سکھانے میں انہوں نے مختلف روشیں اپنائی ہوئی تھیں اسی لیے ان قرائتوں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ بعض افراد نے اس سلسلے میں کوتاہی کی۔ جس کی وجہ سے قرائتوں کی تدوین کا کام تدریجاً سست اور ڈھیلا پڑ گیا جبکہ بے بنیاد اور فضول کاموں میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔

ابن جزری کی تعبیر کے مطابق: ''باطل کا حق کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا ڈر تھا''۔[2] لہذا اس روش کو مدنظر رکھتے ہوئے بزرگوں نے قرائت کے قوانین وضع کیے۔

سب سے پہلے معتبر فرد ابوعبید قاسم بن سلام انصاری (متوفی ۲۲۴ ق) ہیں۔ جنہوں نے صحیح قرائتوں کو جمع کیا اور اس موضوع پر ایک مفصل کتاب بھی لکھی۔ ابن جزری نے صرف پچیس قاریوں کا انتخاب کیا ان میں سات مشہور قاری (قراء سبعہ) بھی شامل

---

۱) سورۂ بقرہ/آیت ۹

۲) النشر فی القراءات العشر؛ جلد ۱ ص ۹

تھے۔اس کے بعد بہت سے دوسرے علماء اور دانشوروں نے اس موضوع پر کام کیا ہے جن کی تفصیل اپنے مقام پر بیان ہوئی ہے۔[1]

سات قرائتوں کا انتخاب

قرائت قرآن سے متعلق مسلمانوں کی دلچسپی کے بارے میں بیان ہو چکا ہے کہ ہر دور میں مسلمان مشہور شخصیات کی قرائت سیکھتے، تدوین کرتے اور اسے قابل قبول بنانے کے لیے کوشاں رہتے۔ ہر علاقے کے لوگ اپنے ہی علاقے کے قاری سے لگاؤ رکھتے تھے اور اس دائمی روش پر شیعہ سنی مسلمانوں میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک قرائت قرآن کے سیکھنے اور سکھانے کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران بغداد کے وحید عصر ''ابن مجاہد'' ظاہر ہوئے۔ جو لوگوں کے دل جذب کرنے اور حکومتی عہدہ داروں میں اثر ورسوخ کی مہارت رکھتے تھے۔ جب وہ رسمی طور پر شیخ القراء کے منصب پر فائز ہوئے تو لوگوں کا مزید رجحان ان کی طرف بڑھ گیا۔

ابن مجاہد انتہائی خشک مزاج تھے اسلاف کی قرائت کی تقلید کے سخت پابند تھے۔ عبدالواحد بن ابی ہاشم کہتے ہیں: کسی نے ابن مجاہد سے پوچھا: آپ کسی مخصوص قرائت کا انتخاب کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا: اسلاف کی اٹھائی ہوئی زحمتوں کی حفاظت اور پاسداری زیادہ اہم ہے یہ بات اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم کسی ایسی قرائت کا انتخاب کریں جو ہمارے بعد رواج پائے۔[2]

ابن مجاہد نے اپنی تمام کاوشیں قرائت میں بابِ اجتہاد مسدود کرنے پر خرچ کیں اور اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ کیونکہ اسلامی معاشرے کے اس تاریک اور نامناسب دور پر سایۂ افگن حالات نے انہیں اپنے مقصد میں کامیابی دی اور مخالفین کو ختم کرنے میں خاصی مدد کی۔ قرائت کو قراء سبعہ (سات قاریوں) میں منحصر کرنا انہیں کا کارنامہ ہے۔ اس میں پائے جانے والے نقائص کے ذمہ دار بھی وہی ہیں کیونکہ انہوں نے اس کام کے انجام دینے میں جلد بازی کی۔

ڈاکٹر صبحی صالح کہتے ہیں: صرف سات قرائتوں کے معتبر ہونے کی غلط فہمی کو ہوا دینے کی ذمہ داری بڑی حد تک ابن مجاہد پر ہے۔ جنہوں نے بغداد میں تیسری صدی کے آغاز پر مکہ و مدینہ، کوفہ و بصرہ اور شام کے مشہور، ثقہ اور امین قراء کی سات قرائتوں کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ جمع وتدوین محض حسنِ اتفاق کی کرشمہ سازی ہے چونکہ اس کے لیے انہوں نے کوئی خاص معیار طے نہ کیا تھا۔ ورنہ ان کے علاوہ بھی خاصی تعداد میں ایسے قراء موجود تھے جن کا علمی پایہ ان سے بھی بلند تر تھا۔[3]

بہر حال ابن مجاہد نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود ان قرائتوں میں سے صرف درج ذیل سات کا انتخاب کیا۔ ان سات میں سے ہر قرائت کے دو راوی ہیں۔

---

[1] علوم قرآنی، ص ۲۲۷۔ ۲۲۳

[2] معرفۃ القراء الکبار، ج ۱، ص ۲۱۷

[3] مباحث فی علوم القرآن، ۲۴۷ نیز ۱۴۸

قرّاء سبعہ اور ان کے راوی

۱۔ابن عامر: عبداللہ بن عامر یحصبی (متوفی ۱۱۸ھ) قاری شام؛ اس کے دو راوی ہشام بن عمار (متولد ۱۵۳ھ، متوفی ۲۴۵ھ) اور ابن ذکوان (متولد ۱۷۳ھ، متوفی ۲۴۲ھ) ہیں یہ دونوں ابن عامر کے دور میں نہ تھے۔

۲۔ابن کثیر: عبداللہ بن کثیر داری (متوفی ۱۲۰ھ) قاری مکہ؛ اس کے دو راوی بزّی (متولد ۱۷۰ھ، متوفی ۲۵۰ھ) اور قنبل (متولد ۱۹۱ھ، متوفی ۲۹۵ھ) ہیں یہ دونوں ابن کثیر کے زمانہ میں نہ تھے۔

۳۔عاصم: عاصم بن ابی النجود اسدی (متوفی ۱۲۸ھ) قاری کوفہ؛ اس کے دو راویوں میں سے ایک اس کا منہ بولا بیٹا حفص بن سلیمان (متولد ۹۰ھ، متوفی ۱۸۰ھ) اور شعبہ ابوبکر بن عیاش (متولد ۹۵ھ، متوفی ۱۹۳ھ) ہیں حفص، عاصم کی قرائت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے عاصم کی قرائت اسی حفص بن سلیمان ہی کے ذریعہ عام ہوئی اور اکثر اسلامی ممالک میں آج تک یہی قرائت (قرائت عاصم بروایت حفص) رائج ہے۔

۴۔ابوعمرو: زبان ابوعمرو بن علاء مازنی (متوفی ۱۵۴ھ) قاری بصرہ؛ اس کے دو راوی، حفص بن عمر (متوفی ۲۴۶ھ) اور سوسی صالح بن زیاد (متوفی ۲۶۱ھ) ہیں انہوں نے بھی ابوعمرو کا زمانہ نہیں دیکھا اور اس کی قرائت یزیدی کے واسطہ سے نقل کی ہے۔

۵۔حمزۃ: حمزۃ بن حبیب زیّات (متوفی ۱۵۶ھ) قاری کوفہ؛ اس کے دو راوی خلف بن ہشام متولد ۱۵۰ھ، متوفی ۲۲۹ھ) اور خلّاد بن خالد (متوفی ۲۲۰ھ) ہیں، جنہوں اس سے قرائت کو بالواسطہ حاصل کیا ہے۔

۶۔نافع: نافع بن عبدالرحمان اللیثی (متوفی ۱۶۹ھ) قاری مدینہ؛ اس کے دو راوی عیسی بن مینا المعروف قالون و ورش اور عثمان بن سعید (متولد ۱۱۰ھ، متوفی ۱۹۷ھ) ہیں یہ قرائت آجکل بعض مغربی عرب ممالک میں رائج ہے۔

۷۔کسائی: علی بن حمزۃ (متوفی ۱۸۹ھ) قاری کوفہ؛ اس کے دو راوی لیث بن خالد (متوفی ۲۴۰ھ) اور حفص بن عمر (متوفی ۲۴۶ھ) ہیں۔

ان سات قاریوں میں سے ابن عامر اور ابوعمرو کے علاوہ باقی پانچ قاری ایرانی الاصل ہیں۔ابن عامر مجہول النسب ہے اور ابوعمرو قبیلہ مازن تمیم سے ہے۔لیکن اس کے متعلق قاضی اسد یزیدی کا کہنا ہے: ابوعمرو ایران کے شہر شیراز کے ایک دیہات "کازرون" کا رہنے والا ہے۔عاصم، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی کھلے عام اپنے شیعہ ہونے کا اظہار کرتے تھے۔ابن کثیر اور نافع کیونکہ دونوں فارس کے رہنے والے تھے لہٰذا ان کے شیعہ ہونے کا امکان ہے۔ابن عامر اموی خاندان کا پلا بڑھا اور غیر مہذّب اور لاپرواہ شخص تھا۔

سوالات

۱۔طبقاتِ قراء سے کیا مراد ہے؟ پہلے طبقے کے افراد کے نام لکھیں؟

۲۔دوسرے طبقے کے چار قاریوں کے نام بیان کریں؟

۳۔اصطلاح میں قرائت کے کیا معنی ہیں؟ قرائت اور تلاوت میں کیا فرق ہے؟

۴۔قرائتوں میں اختلاف کے چند اہم اسباب تحریر کریں؟

۵۔کیا ساتوں مشہور قاری اہل اور قابلِ اعتماد ہیں؟ وضاحت کریں؟

۶۔سات قاریوں میں سے چار کے نام بیان کریں؟

۷۔آج کل اسلامی ممالک میں کون سی قرائت رائج ہے؟

بارہواں سبق

قرائتِ حفص

قرائتِ حفص کے متعلق بحث وگفتگو کرنے سے پہلے کسی بھی قرائت کے قابلِ قبول ہونے کی شرائط بیان کرنا ایک ضروری امر ہے۔

قرائت کے قابل قبول ہونے کا معیار

موردقبول قرائت کا معیار یہ ہے کہ وہ قراء سبعہ سے ہٹ کر عام مسلمانوں کی قرائت کے مطابق ہو۔ کیونکہ قرآن مجید دو طریقوں سے ہم تک پہنچا ہے:

پہلا طریقہ: عوامی؛ جس میں لوگوں نے قرآن مجیداپنے آباء واجداد سے سینہ بہ سینہ حاصل کیااورانہوں نے پیغمبراکرم ﷺ سے حاصل کیا ہے اوراس طرح نسل بہ نسل ہم تک پہنچایا۔ یہ عوامی قرائت گذشتہ تمام مصاحف کی کتابت کے مطابق ہےاورگزشتہ تمام صدیوں میں مسلمان اس کے مطابق قرائت کرتے رہے ہیں۔

دوسراطریقہ: اجتہادی؛ قرائت عاصم بروایت حفص کے علاوہ باقی سب قرائتوں کی روش اجتہادی ہےاورپیغمبراکرمؐ سے منقول نہیں ہیں۔ جبکہ قرآن کریم کی نصّ کے بارے میں اجتہاد کرنا غلط اور نادرست ہے اور یہ کام شرعی لحاظ سے بھی معتبر نہیں ہے۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں چھپنے والے تمام معتبر قرآن کریم قرائت کے لحاظ سے حفص کی قرائت کے مطابق ہیں۔ جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ حفص کی قرائت دوسری سب قرائتوں کے برخلاف اجتہادی نہیں ہے بلکہ ایک منقول روایت ہے جو حضرت علیؑ پر ختم ہوتی ہےاورانہوں نے اسے بذاتِ خود پیغمبراکرم ﷺ سے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ یہ قرائت خود آنحضرت ﷺ سے منقول ہے لہٰذا یہ قرائت اس قرائت کے بالکل مطابق اور ہم آہنگ ہے جو لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سیکھی۔

صحیح اورمتواترقرائت (عوامی قرائت) کی تشخیص کیلئے تین شرائط یہ ہیں:

پہلی شرط: موجودہ مصاحف کی کتابت کے مطابق ہویعنی وہ مصاحف جوگذشتہ تمام صدیوں میں لوگوں کے مضبوط ہاتھوں سے ثبت اور ضبط ہوئے ہیں ان کے عین مطابق ہو۔ بالخصوص اسلامی ممالک میں موجود تمام خطی نسخوں اور شائع شدہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ ایسے نسخے جو بغیر کسی اختلاف کے پیش کیے جاتے رہے ہیں یا اب منظر پر آرہے ہیں۔

دوسری شرط: وہ قرائت، عربی لغت کے فصیح ترین اور مشہور ترین اصول وقوانین کے موافق ہو۔ کیونکہ قرآن مجید فصیح عربی میں نازل ہوا ہے اور اس میں شاذ لغات کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی ہے۔

تیسری شرط: وہ قرائت، شریعت کے مستقل احکام اور عقل کے قطعی قوانین سے ہم آہنگ ہو۔ کیونکہ قرآن شریعت کا بانی اور عقل کے صحیح افکار کو واضح کرنے والا ہے۔

قرائتِ حفص کی خصوصیات

صرف قرائتِ حفص ہے جس کی سند صحیح ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی پشت پناہی کی وجہ سے پائیدار اور مستحکم ہے۔ یہ قرائت صدیوں تک مسلمانوں کے درمیان مسلسل رائج رہی اور آج بھی رائج ہے۔ اس قرائت کے رواج پانے کے درج ذیل چند اسباب ہیں۔

پہلا سبب: قرائتِ عاصم کا عام مسلمانوں میں مشہور ہونا

درحقیقت قرائتِ عاصم وہی عام مسلمانوں میں رائج قرائت ہے۔ کیونکہ حفص اور ان کے استاد عاصم، اس قرائت پر سختی سے پابند تھے، جس کی روایت صحیح اور متواتر ہو اور وہ مسلمانوں کے درمیان عوامی قرائت کے عنوان سے بھی رائج ہو۔ اس قرائت کو عاصم نے اپنے استاد ابوعبدالرحمان سُلمی سے اور انہوں نے اِسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے حاصل کیا اور حضرت علی علیہ السلام بھی وحی الٰہی کی اصلی نص جو مسلمانوں کے درمیان پیغمبر اکرم ﷺ سے بطور مسلسل اور متواتر منقول تھی کے علاوہ کوئی دوسری قرائت نہیں کرتے تھے۔

دوسرا سبب: راویوں کا ثقہ ہونا

حفص نے قرائت عاصم کو مختلف شہروں میں رواج دیا حفص اپنی صلاحیت اور نظم وضبط میں بہت مشہور تھے۔ حفص، قرائتِ عاصم سے متعلق، ان کے دوسرے شاگردوں کی نسبت زیادہ علم رکھتے تھے اور حفص نے قرائتِ عاصم بیان کرنے میں اپنے ساتھی ابو بکر بن عیاش پر سبقت لے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان حفص سے قرائت عاصم سیکھنے کے خواہاں تھے۔

ابن عیاش کہتے ہیں:

عاصم نے مجھے بتلایا: ابوعبدالرحمان کے علاوہ کسی نے قرآن کا ایک حرف بھی میرے لیے قرائت نہیں کیا اور ابوعبدالرحمان نے قرائت حضرت علی علیہ السلام سے سیکھی تھی۔[1]

---

[1] معرفۃ القراء الکبار: ج ۱، ص ۷۵

ابوعمرو دانی کہتے ہیں:

اسی طرح حفص، قرائت عاصم کو، لوگوں کے لیے تلاوت کرتے اور اس کی ترویج اور اشاعت میں کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے بغداد اور مکہ میں عاصم کی قرائت کی تعلیم کا اہتمام کیا۔ [۱]

شاطبی اس کے بارے یوں قصیدہ سرا ہیں:

حفص کی قرائت میں دقت نظر اور پختگی کی وجہ سے دوسروں سے افضل و برتر تھے۔ [۲]

تیسرا سبب: بزرگوں کا اس قرائت کو اپنانا

تاریخ کے تمام ادوار میں قرائت عاصم کو دوسری تمام قرائتوں پر فوقیت حاصل تھی اور یہ قرائت عام مسلمانوں میں رائج اور ان کی توجہ کا مرکز تھی۔ بطورِ مثال چوتھی صدی کے آغاز میں بغداد کے سب سے مشہور قاری ابن مجاہد (متوفی ۳۲۴ھ) کے جلسہ قرائت میں قرائتِ عاصم کے ماہر پندرہ (۱۵) افراد موجود تھے۔ جنہیں ابن مجاہد صرف قرائت عاصم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ [۳]

یانفطویہ ابراہیم بن محمد (متوفی ۳۲۳ھ) نے پچاس سال فن قرائت کی تدریس کی۔ وہ ہمیشہ اپنے جلسہ قرائت کا آغاز عاصم کی قرائت سے کرتے اور پھر اس کے بعد دوسری قرائتوں کے مطابق تلاوت کیا کرتے تھے۔ [۴]

امام احمد بن حنبل نے بھی کہا ہے:

''عاصم ثقہ تھے لہذا میں نے بھی ان (عاصم) کی قرائت کو اختیار کیا ہے''۔ [۵]

اکثر آئمہ قرائت نے اپنی اسنادِ قرائت عاصم سے ملانے کی کوشش کی ہے۔

چوتھا سبب: قرائت عاصم کو امیر المومنین علی علیہ السلام سے نقل کرنے میں حفص کی اسناد کا صحیح اور عالی ہونا

یہ اسناد دوسری قرائتوں کی نسبت بے مثل اور بے نظیر ہیں کیونکہ:

الف: عاصم نے قرائت مکمل طور پر اپنے استاد ابوعبدالرحمان سلمی کے علاوہ کسی دوسرے سے نہیں سیکھی۔

ب: عاصم نے اپنے شیخ اور استاد ابوعبدالرحمان سلمی سے کبھی مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ انہیں یقین تھا جو کچھ انہوں نے ابوعبد الرحمان سلمی سے سیکھا ہے بالکل وہی ہے جسے ابوعبدالرحمان سلمی نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے حاصل کیا ہے۔

۱) طبقات القراء؛ ج۱ص ۲۵۴

۲) شرح الشاطبیہ سراج القاری؛ ص ۱۴

۳) معرفۃ القراء الکبار؛ ج۱ص ۲۱۷

۴) لسان المیزان؛ ج۱ص ۱۰۹

۵) میزان الاعتدال؛ ج۲ص ۳۵۸

خود عاصم اس بارے کہتے ہیں:

مجھے قرائت میں ابوعبدالرحمان سُلمی سے کوئی اختلاف نہ تھا اور نہ ہی میں نے کسی مورد میں ان کی قرائت سے مخالفت کی ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے بھی کسی مورد میں حضرت علی علیہ السلام کی قرائت سے مخالفت نہیں کی۔[1]

ج: عاصم نے اپنی قرائت کی بہترین اور زرّیں اسناد اپنے سوتیلے بیٹے حفص کے علاوہ کسی دوسرے کو تعلیم نہیں دیں۔ یہی بہت بڑی فضیلت ہے جو دوسرے قاریوں میں سے صرف حفص کو عطا ہوئی ہے۔ حفص کی اس خاص اہلیت کی وجہ سے مسلمانوں کا رجحان ان کی قرائت اپنانے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

قرانات سبع کی حجیت

۱۔ کیا قرانات سبع (سات قرائتیں) سب کی سب حجیت رکھتی ہیں؟

۲۔ کیا نماز گذار اِن سات قرائتوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرسکتا ہے؟

اکثر فقہاء اسے جایز سمجھتے ہیں۔

مرحوم سید محمد کاظم یزدی اپنی کتاب ''عروۃ الوثقی'' میں اور مرحوم سید ابوالحسن اصفہانی اپنی کتاب ''وسیلۃ النجاۃ'' میں لکھتے ہیں:

احتیاط یہ ہے کہ نمازی حضرات ان سات قرائتوں سے تجاوز نہ کریں۔

آیۃ اللہ سید ابوالقاسم خوئیؒ:

آپ نے اہل بیت علیہم السلام کے زمانہ میں رائج قرائتوں کے مطابق قرائت کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

آیۃ اللہ سید روح اللہ خمینیؒ فرماتے ہیں:

احتیاط یہ ہے کہ نماز گذار اِن سات قرائتوں سے تجاوز نہ کریں۔

فقہاء کے درمیان مشہور ہے کہ ہر کسی کو اختیار ہے کہ ان سات قرائتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے: ''القرآن واحد نزل من عندِ واحدٍ وانما الاختلاف من قِبل الرواۃ''۔ قرآن واحد ہے۔ خدائے واحد کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اختلاف راویوں کا پیدا کردہ ہے۔ البتہ اہلِ بیت علیہم السلام نے تمام مشہور قرائتوں کے مطابق قرائت کرنے کی اجازت دی ہے اور اس حدیث ''اِقْرَؤُوا کَمَا یَقْرَءُ النّاس'' کو اپنے اس مدعا کی دلیل قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے متعلق آیۃ اللہ سید محسن الحکیمؒ فرماتے ہیں:

یہ مذکورہ حدیث، ان سات قرائتوں کے بارے میں نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ انحصارِ قرأت کا واقعہ اس مذکورہ حدیث کے

---

[1] معرفۃ القراء الکبار؛ ج۱ص۷۵ر الطبقات؛ ج۱ص۳۴۸

صادر ہونے کے دو صدیوں بعد چوتھی صدی کے آغاز میں پیش آیا۔ لہٰذا یہ حدیث آئمہ علیہم السلام کے دور میں مشہور قرائتوں کے بارے میں ہے جو قراءاتِ سبع سے پہلے تھیں۔ پس ہر وہ قرائت جس کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ عصرِ آئمہ علیہم السلام میں شہرت کی حامل تھی، اسے نماز میں قرائت کرنا جائز ہے۔[1]

ہمارا مؤقف یہ ہے کہ خداوند متعال کی طرف سے نازل ہونے والا قرآن صرف ایک ہے اور یہ وہی قرآن ہے جسکی پاسداری لوگ کرتے رہے ہیں۔ صحیح قرائت وہی ہے جسے لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے حاصل کیا ہے یہ موروثی قرائت ہے اس کا قاریوں کی اجتہادی قرائتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ موروثی قرآن اجتہادی قرآن سے جدا ہے۔

امام بدرالدین زرکشی[2] اور آیۃ اللہ سید ابوالقاسم خوئیؒ[3] فرماتے ہیں:

''القرآن والقراءات حقیقتان متغایرتان؛ قرآن اور قراءات دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ قرآن خداوند متعال کی طرف سے پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی ہے جبکہ قراءات اس وحی کی شناخت کے بارے میں قاریوں کا باہمی اختلاف ہے جو بیشتر ان کے ذاتی اجتہادات پر مبنی ہے۔

لہذا حدیث ''اقرؤوا کما یقرأالناس'' اسی حقیقت کے بارے میں ہے جو لوگوں کے درمیان موجود ہے اور یہ انہیں پیغمبر اکرم ﷺ سے وراثت میں ملی ہے۔ اور جو کچھ قاریوں کی زبانوں پر ہے یہ ان کے شخصی اجتہادات ہیں جن پر ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ بنابرایں شرعی طور پر معتبر اور حجیت کی حامل وہ عوامی قرائت ہے جو بغیر کسی اختلاف کے ہمیشہ ثابت ہو۔ تمام ادوار میں موجود خطی نسخوں کے مطابق اور گذشتہ چند صدیوں میں چھپنے والے قرآنی نسخوں کے بھی عین مطابق ہو مزید تمام اسلامی ممالک میں موجود معتبر اور مشہور علمی مراکز میں موجود سب مصاحف میں یکساں ہو اور اس کی کتابت میں بھی کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔

آیۃ اللہ سید روح اللہ خمینیؒ فرماتے ہیں:

احتیاط یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس موجودہ قرآن میں جو کچھ ثبت اور لکھا گیا ہے اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔[4]

قرائت قرآن کے متعلق اہل بیت علیہم السلام کے فرامین

آئمہ اہل بیت علیھم السلام سے قرآن کریم کے بارے میں ایسے فرامین منقول ہیں جن کا اشارہ مذکورہ اہم موضوعات کی جانب ہے اور یہ نہ صرف قرآن کریم پر آئمہ اطہار علیھم السلام کی گہری فکر و نظر بیان کرتے ہیں بلکہ قرآنی نص کی حفاظت اور اسے تحریف و تاویل سے محفوظ رکھنے

[1] مستمسک عروۃ الوثقیٰ؛ ج ۶، ص ۲۴۵۔ ۲۴۲

[2] البرہان؛ ج ۱، ۳۱۸

[3] البیان؛ ص ۱۷۳

[4] تحریر الوسیلۃ؛ ج ۱، ص ۱۵۲، مسئلہ نمبر ۱۴

کے لیے آئمہ معصومین علیہم السلام کی خاص توجہ اور کوششوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں سے چند فرامین بطورِ خلاصہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ محمد بن وراق کہتے ہیں:

میں نے ایک جلد قرآن کریم امام جعفر بن محمد الصادق علیہما السلام کو دکھایا کہ جس میں علامت گذاری سونے کی تھی اور آخری سورتوں میں سے ایک سورہ بھی سونے سے لکھی ہوئی تھی۔ اس نسخہ میں کوئی کمی نہ تھی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ''مجھے پسند نہیں ہے کہ قرآن سیاہ رنگ کے علاوہ کسی دوسرے رنگ سے لکھا جائے، جیسا کہ پہلی بار لکھا گیا تھا''۔

قرآن مجید کی حفاظت اور نگہداری سے متعلق امام علیہ السلام کا یہ فرمان ان کی دقت نظری اور دلچسپی کی نشاندہی کرتا ہے۔ حتیٰ رسم الخط کے رنگ میں بھی اس بات کو اہمیت دی کہ جیسا وہ پہلی بار لکھا گیا اسی طرح سے محفوظ اور باقی رہے۔

۲۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''قرآن واحد ہے اور خدائے واحد کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس میں اختلافات راویوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں''۔

اس فرمان کا معنی یہ ہے کہ قرآنی نص ایک ہے اور خدا کی جانب سے نازل ہونیوالی قرائت بھی ایک ہی ہے جبکہ اس ایک نص کی روایت میں اختلاف قاریوں کے اجتہاد کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔

۳۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''قرآن خدائے واحد کی طرف سے ایک حرف پر نازل ہوا ہے''۔

اس سے مراد مروجہ قرائتوں کی نفی ہے جن کے متعلق لوگ یہ تصور کرتے تھے کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ سے بطور متواتر نقل ہوئی ہیں امام علیہ السلام نے اس بات کا انکار کیا ہے۔ کیونکہ قرآن ایک نص میں نازل ہوا ہے۔ لیکن امام علیہ السلام نے لہجوں کے اختلاف کی نفی نہیں فرمائی۔

۴۔ سالم بن سلمہ کہتے ہیں: ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں قرآن کریم کی چند آیتیں قرائت کیں۔ جیسا کہ میں نے سنا ہے۔ اس کی قرائت دوسرے لوگوں کی قرائت سے مختلف تھی۔ امام علیہ السلام نے اس سے کہا: ''اس قرائت سے پرہیز کرو اور اسے چھوڑ دو اور تم بھی ویسے ہی پڑھو جیسے دوسرے سب لوگ پڑھتے ہیں''۔

شاید اس شخص نے قاریوں کے فن کے مطابق قرآن مختلف وجوہ سے قرائت کیا۔ کیونکہ ایسی قرائتیں قرآن کی نص کے ساتھ ایک طرح کا کھیل شمار ہوتی ہیں۔ لہٰذا امامؑ نے اس سے منع کیا ہے اور وہ مشہور قرائت کہ جسے لوگ پڑھتے ہیں اختیار کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ جس صحیح قرائت کا شریعت نے حکم دیا ہے وہی قرائت ہے کہ جسے بطورِ متواتر ہر نسل نے اپنے سے پہلی نسل سے اور انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے اور آپ ﷺ نے جبرئیل سے اور انہوں نے خداوند متعال سے حاصل کیا ہے۔

رائج قرآن سے شیعوں کا تعلق

بعض ناواقف اور خود غرض افراد نے شیعوں کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ ان کے پاس اپنا مصحف (قرآن) ہے اور وہ اسے ''المصحف الشیعی'' کہتے ہیں۔ حالانکہ خود شیعوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ متاخرین میں سے محققین

کے ایک گروہ نے اس دعوے پر شدید تنقید کی ہے اور اعتراض کیا ہے۔ان میں سب سے اہم گولڈ زیہر ہے جس نے مسلمانوں کے پاس موجود قرآن مجید کی رسمی نص سے شیعوں کے خاص تعلق اور وابستگی کی صراحت سے تائید کی ہے۔قرآن مجید کی موجودہ نص سے شیعوں کے تعلق کی وضاحت کیلئے ان مطالب کا بیان کرنا ضروری ہے۔

جب ہم قرآن مجید کی تاریخ، نسل بہ نسل اس پر گزرنے والے ادوار اور مراحل کی تحقیق کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ موجودہ صورت میں قرآن مجید کی نص درحقیقت شیعوں ہی کی بھرپور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

شیعوں ہی نے قرآن مجید کو ثبت وضبط اور محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت ہی اچھے انداز میں اس کی تنظیم وترتیب، شکل گذاری اور خوبصورتی میں کسی بھی اقدام سے دریغ نہیں کیا ہے۔درحقیقت اگر کوئی ایسا قرآن ہے کہ جسے **مصحفِ شیعی** کہا جائے تو وہ صرف یہی موجودہ قرآن ہے۔کیونکہ مصحف سے متعلق پوری تاریخ میں شیعہ آئمہ، حفاظ، قرّاء اور ہنرمندوں نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس بناء پر موجودہ قرآن شیعوں ہی سے منسوب کیا جانا ضروری ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کریم کو اکٹھا کیا۔اس زمانے میں ''اتحادِ مصاحف'' سے پہلے جو مصاحف تیار ہوئے وہ یہ ہیں: مصحفِ عبداللہ ابن مسعود، مصحف اُبی ابن کعب، مصحفِ ابوالدرداءؓ، مصحفِ مقداد بن اسود یہ سب خاندانِ نبوت سے خاص محبت رکھنے والوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

عہدِ عثمانؓ میں اتحادِ مصاحف کا مشورہ دینے والے سب سے پہلے شخص حذیفۃ بن الیمان تھے۔مصاحف کی نسخہ برداری کے وقت قرآن کریم کی املاء کروانے کے ذمہ دار ابی ابن کعب تھے۔جب کبھی قرآن مجید کے الفاظ ثبت کرنے اور ان کی کتابت میں کوئی مشکل پیش آتی تو اس کے حل کیلئے انہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔مصحف کی شکل وصورت اور نقطہ گذاری ابوالاسود دوئلی اور اس کے دوشاگردوں نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر کے ہاتھوں انجام پائی۔سب سے پہلے خالد بن ابی الہیاج نے مصحف کی تزئین وآرائش کی اور اس کے رسم الخط کو خوبصورتی عطا کی اور یہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے صحابی تھے۔موجودہ شکل میں حرکات ایجاد کرنا استاد خلیل بن احمد فراہیدی کا عظیم کارنامہ ہے۔جنہوں نے پہلی بار ہمزہ، تشدید، رَوم اور اشمام کی اصطلاحات بنائیں۔ان مذکورہ تمام افراد کا شمار شیعوں ہی کے مشہور علماء ودانشوروں میں سے ہوتا ہے۔

بعض کے نزدیک سات بڑے قاریوں میں سے چھ افراد شیعہ تھے یا کم از کم چار افراد حتمی طور پر شیعہ تھے۔علاوہ ازیں آئمہ قرائت میں سے ایک بڑے گروہ کا شمار بھی شیعوں ہی میں سے ہوتا ہے۔لیکن عصرِ حاضر میں موجودہ قرائت (قرائتِ حفص) ایک خالص شیعہ قرائت ہے جسے امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی حفص نے اپنے استاد عاصم سے روایت کی ہے۔یہ بھی شیعوں کی عظیم شخصیات میں سے ہیں۔عاصم نے یہ قرائت اپنے اور استاد ابوعبدالرحمان سُلمی سے سیکھی اور سُلمی جو امیر المومنین حضرت علیؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے انہوں نے اسے بلاواسطہ حضرت علی علیہ السلام سے حاصل کیا ہے اور انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے اور آنحضرت ﷺ نے اسے (جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ) خداوند متعال جلّ جلالہ سے دریافت کیا ہے۔

سوالات

۱۔قرآن کریم کتنے طریقوں سے ہم تک پہنچا ہے؟ان میں سے کون ساطریقہ معتبر ہے؟

۲۔صحیح اور متواتر قرائت کے پہچاننے کی شرائط بیان کریں؟

۳۔عاصم سے منقول حفص کی قرائت کی تین خصوصیات مختصر وضاحت کے ساتھ بیان کریں؟

۴۔کیا حدیث "اقرأوا کمایقرأ الناس" سات قرائتوں کے معتبر ہونے کی دلیل بن سکتی ہے؟ وضاحت کریں؟

۵۔آئمہ معصومین علیہم السلام کے فرامین میں سے کوئی ایسی حدیث بیان کریں جو قرآن کریم کی حفاظت پر اُن کی خاص توجہ اور اہمیت پر دلالت کرتی ہو؟

تیرہواں سبق

قرآن مجید میں نسخ کا وجود

نسخ کی حکمت

آگے بڑھتی ہوئی ہر اصلاحی تحریک کے دوران بعض اصول وضوابط اور دستور العمل کا منسوخ ہونا تکامل کا لازمہ ہے۔ کیونکہ ایک معاشرتی تحریک میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے لائحہ عمل میں تدریجاً نظر ثانی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ البتہ یہ صورت حال اس وقت تک ہوتی ہے جب تک یہ تحریک اپنے کمال مطلوب تک نہ پہنچے۔ جونہی لائحہ عمل اپنے عروج اور کمال تک پہنچے گا، نسخ کا مسئلہ بھی ختم ہوجائے گا۔ لہٰذا کسی بھی شریعت میں نسخ اس وقت تک ہے جب تک پیغمبر زندہ ہو۔ اس کی وفات کے بعد شریعت میں نسخ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

کسی بھی شریعت میں پے در پے نسخ، ڈاکٹر کے ان نسخوں کی طرح ہے جو مریض کی صورت حال کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، یعنی اگر کل والا نسخہ مفید تھا تو آج کا یہ نیا نسخہ بھی اپنی جگہ پر مفید ہے۔ اسی لیے خداوند کریم کا فرمان ہے:

''مَا نَنسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا [1]؛ ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا (تمہارے ذہن سے) مٹا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور نازل بھی کردیتے ہیں''۔[1]

پس جو بھی نسخ واقع ہوتی ہے وہ اپنی جگہ پر صحیح ہوتی ہے کیونکہ اس میں حالات کے مطابق بہترین راہ حل کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

نسخ کی تعریف

گذشتہ بیان کی روشنی میں نسخ کی تعریف یہ ہے: ''نئے حکم کے ذریعہ گذشتہ حکم (جو بظاہر دائمی تھا) کالعدم قرار دینا اس طرح کہ نیا حکم گذشتہ حکم کی جگہ لے لے اور دونوں کا ایک وقت میں اکٹھا ہونا ممکن نہ ہو''۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیش آئے کہ قرآن مجید میں منسوخ آیتوں کے وجود کا بنیادی طور پر کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ کیا مفہوم سے خالی صرف الفاظ کی تلاوت ہے؟

[1] سورۂ بقرہ/آیت ۱۰۶

اس سوال کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے:

اول۔ قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ آیتوں کا وجود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شریعت کے احکام مرحلہ وار اور تدریجی ہیں۔ خود اس بات کی ایک خاص تاریخی اور دینی اہمیت ہے جس سے شریعت کے تکمیلی مراحل کا اظہار ہوتا ہے۔

دوم۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک اہم پہلو اس کا ''اعجازِ بیان'' ہے۔ جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اسے ثابت اور پائیدار رہنا چاہیے کیونکہ قرآن کریم معجزۂ جاوید ہے۔

سوم۔ قرآن مجید میں منسوخ آیتوں کی جو تصویر کشی ہوئی ہے اس کے مطابق تقریباً تمام منسوخہ آیات مشروط نسخ شمار ہوتی ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر وہ شرائط اور حالات دوبارہ پیدا ہو جائیں تو ان مشروط منسوخہ آیات کا حکم بھی دوبارہ سے قابلِ اجراء ہو جائے گا۔

نسخ کی شرائط

نسخ کی شرائط یہ ہیں:

۱۔ نسخ کا دائرہ صرف شرعی احکام ہیں۔ پس شرعی احکام سے ہٹ کر انجام پانے والی نسخ ہماری بحث سے خارج ہے۔

۲۔ عنوان کا تبدیل نہ ہونا: جیسے اختیاری حالت سے اضطراری حالت میں تبدیلی یا مسافر اور غیر مسافر کے عنوان میں تبدیلی وغیرہ۔ ان صورتوں میں ہر قسم کی تبدیلی حکم نسخ کے دائرہ سے خارج ہے۔ کیونکہ ہر موضوع کا اپنا ایک جدا حکم ہوتا ہے اور عنوان کی تبدیلی سے اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے۔

۳۔ ناسخ اور منسوخ کے درمیان منافات اور ان دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو۔ لیکن اگر دو حکم ایک ہی وقت میں اکٹھے ہوں تو اس صورت میں نسخ واقع نہیں ہوتی۔

۴۔ منسوخ کو کسی خاص معین وقت کے ساتھ محدود نہ کیا گیا ہو کیونکہ اگر سابقہ حکم کی مدت شروع ہی سے معین ہو تو مقررہ وقت آنے پر وہ حکم خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور نسخ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

نسخ کی اہمیت

نسخ کے بارے میں بات کرنے کی اہمیت واضح اور روشن ہے کیونکہ ایک فقیہ جو قرآن پاک سے فقہی احکام اُخذ کرتا ہے یا ایک متکلم جو قرآنی معارف کے حصول میں کوشاں ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ منسوخہ آیات کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایک فقیہ فتویٰ دیتے وقت اور ایک قاضی فیصلہ سناتے وقت آگاہ رہے کہ اس کا فتویٰ یا حکم منسوخہ آیات پر مبنی نہ ہو۔

ابوعبدالرحمان سلمی کہتے ہیں: امیر المومنین علی علیہ السلام قاضی کوفہ سے ملے تو آپؑ نے اس سے پوچھا: ''کیا تم ناسخ آیتوں کو

منسوخ آیتوں سے جدا کرنا جانتے ہو؟ قاضی نے جواب دیا: ''نہیں''۔ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''اس صورت میں تم نے خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈال رکھا ہے''۔[1]

نسخ کی حقیقت

جیسا کہ بیان ہوا نسخ سابقہ حکم کو نئے حکم میں تبدیل کرنا ہے۔ جسے عرف عام میں تجدید نظر کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ شارع نے سابقہ حکم بطورِ مطلق بیان کیا تھا جس سے یہ دائمی حکم ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر سابقہ حکم کے مطلق ہونے میں نظر ثانی کر کے اسے منسوخ کر دیا اور اس کی جگہ نیا حکم صادر ہوگیا۔ اس طرح کی نظر ثانی سے آئندہ کے حالات کے بارے میں ایک قسم کی لاعلمی کا شائبہ ہوتا ہے جو خدا کے علم ازلی کے منافی ہے وہ علم جو ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔

نسخ کا یہ معنی انسانی قوانین میں ایک امر طبیعی ہے کیونکہ انسان آئندہ پیش آنے والے تمام حالات و واقعات کی پیش بینی نہیں کر سکتا۔ لیکن نسخ نظر ثانی کے معنوں میں آسمانی شریعتوں کے متعلق ہرگز معقول نہیں ہے۔

پس الٰہی ادیان میں نسخ اپنے حقیقی لفظی معنی میں نہیں بلکہ نسخ ظاہری اور اصطلاحی معنی میں ہے یعنی ظاہری طور پر لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ کوئی چیز منسوخ ہوئی ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ پروردگار سابقہ حکم کو صادر کرتے وقت جانتا تھا کہ یہ حکم دائمی نہیں اور اس کی مدت محدود ہے۔ اس کی مدت خدا کے نزدیک معین تھی فقط کسی مصلحت کے پیش نظر مدت بیان نہیں ہوئی اور موقع آنے پر اور گذشتہ حکم کی مدت کے اختتام پر نیا حکم بیان ہوگیا۔ اس تشریح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت نسخ واقع ہی نہیں ہوئی بلکہ خدا نے ابتدا ہی سے سابقہ حکم کو محدود وقت کیلئے وضع کیا تھا اور پھر نئے حکم کی تشریع سے خود بخود اس پہلے حکم کی مدت کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

قرآن مجید میں نسخ کی ممکنہ اقسام

قرآنی آیتوں میں نسخ کی چند اقسام ممکن ہیں جن میں سے بعض قابل قبول اور بعض مسترد کی گئی ہیں۔

۱۔ آیت اور حکم کی منسوخی

کسی شرعی حکم پر مشتمل آیت کلی طور پر منسوخ ہو یعنی قرآن مجید سے آیت کے الفاظ مٹا دیئے جائیں اور آیت کے مفہوم پر مشتمل حکم بھی منسوخ ہو جائے۔

۲۔ صرف آیت کا منسوخ ہونا

آیت کے الفاظ اور عبارات کو تو مٹا دیا جائے لیکن اس آیت کے مفہوم پر مشتمل حکم اسی طرح باقی رہے اور منسوخ نہ ہو۔

---

۱) تفسیر عیاشی؛ ج ۱، ص ۱۲، نمبر شمارہ ۹

۳۔صرف حکم کی منسوخی

آیت کے الفاظ اور عبارات قرآن مجید میں اسی طرح قائم رہیں اور ان کی تلاوت بھی ہوتی رہے لیکن اس آیت کے مفہوم پر مشتمل حکم منسوخ ہو جائے۔

۴۔مشروط نسخ

یہ وہی تیسری قسم ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ سابقہ حالات کے پلٹنے پر پہلا منسوخ حکم دوبارہ لاگو ہو جائے۔نتیجہ میں منسوخ اور ناسخ دونوں حکم اپنے حالات وشرائط سے وابستہ ہیں۔

مشروط نسخ کا نسخ کی ممکنہ اقسام میں سے تیسری قسم کے ساتھ فرق یہ ہے کہ اُس میں نسخ مطلق تھی اور منسوخ حکم ہمیشہ کیلئے نا قابل تکرار تھا۔لیکن مشروط نسخ میں منسوخہ حکم شرائط اور ماحول کے وجود میں آنے سے دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے اور قابل اجراء ہو جاتا ہے۔

ہماری نظر میں صرف تیسری اور چوتھی قسم صحیح ہیں اور قرآن میں واقع بھی ہوئی ہیں۔جبکہ نسخ کی پہلی دو قسمیں باطل ہیں۔اگر چہ نسخ کی پہلی قسم (آیت اور حکم دونوں کی منسوخی) کا تصور ممکن ہے لیکن قرآن میں ایسا کوئی مورد نہیں پایا جاتا۔نسخ کی دوسری قسم (صرف آیت کی منسوخی) نہ صرف قرآن میں اس کے متعلق کوئی مثال نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اصلاً معقول نہیں ہے کیونکہ یہ عقلاً محال ہے کہ ایک ایسی آیت قرآن کریم سے حذف کردی جائے جو کسی شرعی حکم پر دلالت کرتی ہو لیکن اس کا حکم باقی رہے۔

منسوخہ آیتوں کی تعداد

قدماء کے نزدیک نسخ کا مفہوم اس کی موجودہ تعریف کی نسبت بہت عام تھا۔قدماء سابقہ حکم میں ہر قسم کی تبدیلی کو ''نسخ'' کہتے تھے۔حالانکہ متاخرین نے نسخ کی اصطلاحی تعریف یوں کی ہے کہ ''سابقہ حکم کی جگہ پر نئے حکم کا آنا'' یعنی پچھلا حکم مکمل طور پر منسوخ ہو جائے اور اس کی جگہ نیا حکم لے لے۔

جنہوں نے نسخ کو قدماء کے نزدیک اس کے عام مفہوم میں لیا ہے یا نسخ کے واقع ہونے میں مقررہ شرائط کی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے منسوخہ آیتوں کی تعداد ۲۲۸ تک ذکر کی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہ تعداد بہت زیادہ اور مبالغہ ہے اور نسخ کے قواعد سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی منسوخہ آیتوں کی تعدادِ کثرت کی نفی کرتے ہوئے ان کی تعداد اکیس (۲۱) بیان کی ہے۔آیۃ اللہ خوئیؒ، فقط ایک آیت (آیتِ نجویٰ) کے نسخ کے قائل ہیں۔لیکن نسخ کی شرائط اور خاص طور پر مشروط نسخ والے قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آٹھ موارد میں نسخ واقع ہوئی ہے۔اس بنا پر قرآن کریم میں منسوخ آیتوں کی تعداد تقریباً بیس (۲۰) سے کچھ زیادہ ہوگی۔[۱]

۱) التمہید: ج۲،ص ۲۱۷۔۳۰۲

اب منسوخہ آیات میں سے دو نمونے درج ذیل ہیں:

۱۔ آیت نجویٰ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بہت سے لوگ بے وقت آپؐ کیلئے زحمت کا باعث بنتے تھے۔ اکثر ایسے مسائل پیش کرتے جو آپ کی شان کے خلاف تھے یا بسا اوقات بیہودہ باتیں کرتے تھے۔ اس لیے خدا کی طرف سے یہ حکم آیا کہ ہر سوال کرنے کے عوض پہلے کچھ صدقہ دیں اور پھر سوال کریں تا کہ اس طرح سوال کم ہو جائیں اور صرف اہم سوال کیے جائیں۔

''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ؛ اے ایمان والو جب بھی رسول سے کوئی راز کی بات کرو تو پہلے صدقہ نکال دو کہ یہی تمہارے حق میں بہتری اور پاکیزگی کی بات ہے پھر اگر صدقہ ممکن نہ ہو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے''۔ [1]

لیکن اس حکم کے آتے ہی سب نے سوال کرنا بالکل ہی ترک کر دیا۔ فقط حضرت علی علیہ السلام ہی تھے جن کے پاس صرف ایک دینار تھا جسے دس درہم کے بدلے فروخت کیا اور انہیں ضروری مسائل جاننے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ یہاں تک کہ مذکورہ آیت میں بیان ہونے والا حکم اس مندرجہ ذیل آیت سے منسوخ ہو گیا: ''ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ؛ کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی راز دارانہ باتوں سے پہلے خیرات نکال دو؟ اب جب کہ تم نے ایسا نہیں کیا ہے اور خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے تو اب نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اللہ تمارے اعمال سے خوب باخبر ہے''۔ [2]

یہ بات واضح ہے کہ اس آیت میں نسخ محتوا یعنی حکم منسوخ ہوا ہے۔ کیونکہ سابقہ حکم (ہر سوال پر صدقہ دینا) مکمل طور پر ختم ہو گیا اور اس کی جگہ نیا حکم آ گیا ہے۔

۲۔ آیاتِ صفح اور درگذر

صدر اسلام میں مسلمانوں کو خاص طور پر مکہ میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ مشرکوں کے ظلم وستم کے مقابلہ میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں۔ کیونکہ مکہ میں مسلمان طاقت کے لحاظ سے ضعیف و ناتواں تھے اور مشرکوں کے ساتھ مقابلے کی صورت میں ان کے نابود ہونے کا خطرہ تھا۔ سورۂ جاثیہ کی چودھویں آیت میں پروردگار کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ؛ اے رسول مومنوں سے کہہ دو کہ وہ ان لوگوں سے درگذر کریں جو ایام

[1] سورۂ مجادلہ/آیت ۱۲

[2] سورۂ مجادلہ/آیت ۱۳

اللہ (جزا کیلئے مقرر دن) کی توقع نہیں رکھتے۔

ایام اللہ، سے مراد ہولناک واقعات ہیں اور یہ خدا کے دردناک عذاب پر کنایہ ہے۔

لیکن جب اسلامی معاشرے کو قدرت اور طاقت حاصل ہوگئی تب جہاد کی اجازت کا حکم صادر ہوا:

''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ'' جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جارہی ہے انہیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی اجازت دے دی گئی۔ یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔[1]

پھر مقابلے کا حکم آیا حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ مومنین کو جہاد پر آمادہ کریں۔[2]

اور یہ آیت بھی نازل ہوئی ''فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ'' تم ویسا ہی برتاؤ کرو جیسی زیادتی تم پر کی گئی ہے۔[3]

نیز ''فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ؛ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو''۔[4] یہ تمام آیتیں مدنی سورتوں میں ہیں۔

مشروط نسخ پر واضح دلیل آیاتِ صفح یعنی اسلام کے دشمنوں اور مشرکوں سے چشم پوشی کرنے والی آیتیں ہیں۔ اس لیے منسوخ آیتوں کا تعلق اپنے موقع و محل اور مخصوص حالات سے ہے۔ چنانچہ جب اور جہاں اس قسم کے حالات درپیش ہوں تو درگذر اور چشم پوشی کرنے والی آیتوں سے پھر سے جان آ جائے گی اور یہ قابل اجراء ہوں گی۔

سوالات

۱۔ نسخ کی تعریف اور اس کی شرائط بیان کریں؟

۲۔ کیا پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد بھی نسخ کا امکان ہے؟ کیوں؟

۳۔ قرآن کریم میں منسوخہ آیات کے پائے جانے کے تین فوائد بیان کریں؟

۴۔ حقیقی نسخ (لغوی) اور ظاہری نسخ (اصطلاحی) سے کیا مراد ہے؟ شرائعِ الٰہی میں کون سا نسخ واقع ہوا ہے؟ اور کیوں؟

۵۔ قرآن کریم میں کتنے قسم کا نسخ واقع ہوا ہے؟ ہر ایک کی تعریف کریں؟

۶۔ نسخِ مشروط اور نسخِ حکم کے درمیان فرق بیان کریں؟

۷۔ منسوخہ آیات میں سے کسی ایک آیت کی اس کی ناسخہ آیت کے ہمراہ مختصر وضاحت کریں؟

---

[1] سورۂ حج/ آیت ۳۹

[2] سورۂ انفال/ آیت ۶۵

[3] سورۂ بقرہ/ آیت ۱۹۴

[4] سورۂ توبہ/ آیت ۵

چودہواں سبق

محکم اور متشابہ

متشابہ کے مقابلے میں محکم، مضبوط اور پائیدار کے معنی میں ہے۔ یہ ''حَکَمَ حَکْماً'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جو مَنَعَ مَنْعاً کا معنی دیتا ہے یعنی ہر قسم کی رخنہ اندازی اور تباہی سے روکنے کے معنی دیتا ہے۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں:

''حَکَمَ اَصلُہٗ مَنع مَنعًا لِاِصْلاَحٍ'' گھوڑے کی لگام کو بھی عربی میں ''حَکَمَۃُ الفَرَسِ'' کہتے ہیں کیونکہ وہ اسے سرکشی سے روکتی ہے۔ حَکَم دراصل اصلاح کی غرض سے کسی برے کام سے روکنے کے معنی میں ہے۔ لہذا ہر وہ کلام اور گفتگو جو واضح ہو اور اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو اسے محکم کہتے ہیں یعنی پختہ، مضبوط اور پائیدار۔

تشابہ کا مادہ اسم مصدر ''شِبہ'' سے ہے جس کے معنی ہیں: ہم رنگ اور ایک دوسرے کے مشابہ یا مصدر ''شَبَہ'' ہے جو ''ایک جیسا ہونا'' کے معنی میں ہے جو حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے شک وشبہ ایجاد کرنے کا باعث بنتا ہے۔

اصطلاح میں تشابہ کی تعریف یہ ہے:

ہر وہ گفتار یا کردار کہ جس کا ظاہر مبہم ہو اور اس کے ذریعہ مخاطب غلطی یا اشتباہ کا شکار ہو جائے اسے ''متشابہ'' کہا جاتا ہے۔ جس کا ظاہر اس کی اصلی غرض کو بیان نہ کر سکے اور لوگ اس وجہ سے اشتباہ میں پڑ جائیں۔

قرآن مجید میں متشابہات

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۷ میں قرآنی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ محکم آیات ۲۔ متشابہ آیات

''هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ؛ اس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں جو اساس و بنیاد

کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔ اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہی متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں۔ حالانکہ اس کی تاویل کا علم صرف خدا کو ہے اور اُنھیں جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ سب کی سب محکم و متشابہ ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے ہیں اور یہ بات سوائے صاحبانِ عقل کے کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے''۔

محکم آیات جو قرآن کریم کی بیشتر آیات پر مشتمل ہیں غیر متشابہ اور رسا ہیں کج فہمی کا سبب نہیں بنتی۔ انہیں محکم کہا جاتا ہے چونکہ یہ مستحکم اور خلل ناپذیر ہیں۔ قرآن کریم میں محکم آیات کے ساتھ ساتھ ایسی آیات بھی موجود ہیں جن کے ظاہر سے ان کی حقیقی مراد اور اصلی غرض سمجھ نہیں آتی۔ کیونکہ وہ مبہم ہیں جو فتنہ گروں کے اعتراض اور بسا اوقات دلیل کا باعث بنتی ہیں کہ جن کی بنا پر وہ بدعتیں ایجاد کرتے ہیں، انہیں ''متشابہ آیات'' کہا جاتا ہے۔

راغب اصفہانی نے متشابہ آیات کے بارے میں کہا ہے:

متشابہات قرآن وہ ہیں جن کی تفسیر کرنا مشکل ہو کیونکہ اپنے حقیقی معنی کے برخلاف ان کی ظاہری مشابہت کسی دوسری چیز کے ساتھ ہوتی ہے۔ البتہ وہ دوسری چیز ضلالت و گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ ''فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ''[1]۔

اس تعریف کے مطابق قرآن کریم میں حق اور باطل کا تشابہ ہے۔ پس جب بھی کلام اللہ یعنی قرآن مجید کی آیتوں میں حق کے علاوہ کوئی چیز ظاہر ہو اور باطل کے مشابہ ہو تو اسے ''متشابہ'' کہتے ہیں۔

پس متشابہ آیات میں تشابہ کا مطلب، حق اور باطل کے درمیان ایسی مشابہت ہے جس کی وجہ سے خداوند کریم کا حق کلام، باطل کی صورت میں دکھائی دے۔

قرآن کریم میں تشابہ کی قسمیں

بنیادی طور پر قرآن مجید کی آیتوں میں دو قسم کا تشابہ پایا جاتا ہے۔ **اصلی اور عرضی**

ا۔ اصلی تشابہ: آیتوں کے الفاظ کی کمی اور معنی کی وسعت کی وجہ سے طبیعی طور پر وجود میں آنے والے تشابہ کو ''اصلی تشابہ'' کہتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف سے عربی زبان میں وضع شدہ کلمات اور الفاظ زیادہ تر مختصر اور سطحی معنی کیلئے وضع ہوئے ہیں۔ ان میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ وسیع اور عمیق معنی کا مفہوم ادا کریں۔ جب کہ دوسری طرف سے قرآن مجید پر بھی لازم تھا کہ وہ عربوں کے طرز کلام اور وضع شدہ الفاظ سے استفادہ کرے ''إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ؛ بے شک ہم نے اسے عربی زبان میں قرآن قرار دیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو''۔[2] لہذا اعلیٰ اور وسیع معانی کے بیان کیلئے مجبوراً اسے کنایہ، مجاز اور استعارہ کا راستہ اختیار کرنا

---

[1] سورہ یونس ر آیت ۳۲

[2] سورۂ زخرف ر آیت ۳

پڑا جو خود عربوں کیلئے بھی عجیب وغریب تھا۔

مبدأ و معاد، انسان کی استطاعت، قدرت، اختیار، کائنات میں اس کے تصرف کی حدود، آغازِ خلقت، فرائض کے فلسفے وغیرہ جیسے موضوعات پر آیات عام طور پر اسی قسم سے ہیں۔ کیونکہ ان کے معانی بہت اعلیٰ، گہرے اور دقیق ہوتے ہیں لیکن ان معانی کیلئے مستعمل الفاظ نارسا مبہم اور قاصر ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی مجموعی دیگر آیات کی نسبت ایسی متشابہ آیات کی تعداد بہت کم ہے۔ محکم آیات جوامٔ الکتاب کہلاتی ہیں، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث اور اسلاف وعلماء کی جانب رجوع کرنے سے ان کے مفاہیم معلوم ہو جاتے ہیں۔

۲۔ عرضی تشابہ:

نزول قرآن کے بعد کے زمانوں میں آراء ونظریات کے باہمی ٹکراؤ اور مختلف مذاہب ومکاتب کے وجود میں آنے کی وجہ سے قرآن کریم میں عرضی تشابہ پیدا ہوا۔ قرآن کریم کی یہ آیات صدرِ اسلام میں متشابہ نہیں تھیں اور مسلمان اپنی سلامتِ طبع اور خلوص نیت سے ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اسی لیے اکثر وبیشتر ان کے معنی اور مقصد اچھی طرح سے سمجھ جاتے تھے اور کسی قسم کا شبہ بھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن کلامی مسائل اور اختلافی بحثوں کے وجود میں آنے اور یونان سے اسلامی مملکت میں نفوذ پیدا کرنے والے بعض ملے جلے اور ناپختہ فلسفی مطالب کے رائج ہونے سے بہت سی آیات کے چہرے پر شکوک وشبہات اور ابہام کا پردہ پڑ گیا۔ جو آیتیں پہلے محکمات میں سے تھیں، آج وہ متشابہات کے زمرے میں چلی گئی ہیں۔ قرآن کریم میں بیشتر یہی عرضی تشابہ پایا جاتا ہے اور آج کل زیر بحث اکثر آیتیں اسی طرح کی ہیں۔

تفسیر میں تشابہ

محکم اور متشابہ کے متعلق بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ہیں جو زیادہ تر آپس میں ملی جلی ہیں۔ البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے قابل ہیں۔ کیونکہ بعض نے مصادیق وموارد کا تعین کر دیا ہے اور کچھ نے متشابہات کو مبہمات سمجھ لیا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ نے اپنی تفسیر میں محکم اور متشابہ کی سولہ (۱۶) صورتیں جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے بھی زیادہ ذکر کی ہیں جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے مثلاً:

۱۔ منسوخہ آیتیں متشابہ ہیں اور ناسخ آیتیں محکمات میں سے ہیں۔

۲۔ آیات الاحکام محکمات ہیں اور دوسری آیات متشابہات میں سے ہیں۔

۳۔ متشابہ وہ ہے جس کی حقیقت تک عقل کی رسائی نہیں ہوتی جبکہ محکم کی حقیقت تک عقل کی رسائی ہوتی ہے۔

۴۔ متشابہ کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں جبکہ محکم کا صرف ایک معنی ہوتا ہے۔

۵۔ متشابہ کا مفہوم پیچیدہ اور مشکل ہوتا ہے اور محکم کی دلیل واضح اور پائیدار ہوتی ہے۔

۶۔ متشابہ میں اجمال پایا جاتا ہے اور ان کے کوئی واضح معنی نہیں ہیں۔

۷۔ محکم آیات انبیاء اور سابقہ امتوں کے واقعات سے متعلق ہیں جبکہ متشابہات مذکورہ آیتوں میں پایا جانے والا ابہام ہے۔[1]

تشابہ کے اسباب

جیسا کہ تشابہ کی اقسام کے بارے میں بیان ہوا، اسی طرح تشابہ کے اسباب بھی دو طرح کے ہیں: اصلی اور عرضی۔

۱۔ اصلی تشابہ: کاملاً طبیعی امر ہے کیونکہ یہ تشابہ عمیق اور گہرے معانی کو عربوں میں رائج الفاظ کے ذریعے بیان کرنے سے وجود میں آیا کہ جنہیں سطحی معانی کیلئے وضع کیا گیا تھا۔

۲۔ عرضی تشابہ: یہ تشابہ قرآن کریم پر زبردستی ٹھونسا گیا ہے یعنی ایسی متشابہ آیات عربوں میں رائج روش اور اسلوب کے مطابق بیان ہوئیں۔ جن میں کسی طرح کی کوئی پیچیدگی نہیں پائی جاتی تھی اور آغاز میں اصلاً شبہ پیدا نہیں کرتی تھیں۔ لیکن مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے آپس میں عقیدتی اور فکری اختلافات کی وجہ سے عرضی تشابہ کا سانحہ ان آیات کے دامنگیر ہو گیا۔

تفسیر اور تاویل

ہر آیت میں ابہام پایا جاتا ہے چاہے وہ محکم ہو یا متشابہ۔ لیکن متشابہ آیات میں تشابہ الفاظ میں ابہام پیدا کرنے کے علاوہ ان کے مفہوم میں شبہات کا باعث بھی بنتا ہے۔ لہذا ہر متشابہ کا مفہوم سمجھنے کیلئے ضروری ہے پہلے اس سے ابہام دور کریں اور پھر ان سے شبہات کو دور کریں۔ محکم اور متشابہ ہر دو آیتوں میں پائے جانے والے ابہام کے بیان کرنے کو "تفسیر" اور صرف متشابہ آیات میں موجود شبہات کے بیان کو "تاویل" کہا جاتا ہے۔

تفسیر کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"تفسیر مشکل الفاظ کے چہرے سے پردہ ہٹانا ہے کہ جب ابہام کا دائرہ لفظ کو گھیرے ہوئے ہو اور اس سے معنی کے اوپر پردہ پڑا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ مفسر اپنے وسائل سے اس ابہام کو برطرف کرنے کی کوشش کرے" (تفسیر کے منابع اور مبانی ابہام کے دور کرنے کا ذریعہ ہیں)۔

تاویل "اول" کے مادہ سے لیا گیا ہے بنابریں تاویل "لوٹانا" کے معنی میں ہے۔ تاویل وہاں پیش کی جاتی ہے جہاں کسی قول یا فعل میں ایسا شبہ پایا جاتا ہو جو حیرانی اور سرگردانی کا موجب ہو۔ لہذا تاویل کنندہ جو تاویل کے طریقے صحیح طور پر جانتا ہے شبہ کو برطرف کرتا ہے اور اس گفتار کے شبہ نما ظاہر کو اس کے اصلی مقام اور صحیح معنی کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے ساتھی (حضرت خضرؑ) نے انہیں حیرت زدہ اور متعجب پایا تو انہیں بشارت دی کہ وہ انہیں اپنے راز سے

---

[1] علوم قرآنی، ص ۲۸۵۔۲۸۱

باخبر کریں گے اور اپنے عمل کی صحیح تاویل بیان کریں گے:

''سَأُنَبِّئُکَ بِتَأوِیلِ مَا لَم تَستَطِع عَلَیهِ صَبرًا؛ عنقریب میں تمہیں ان تمام باتوں کی تاویل بتادوں گا جن پر تم صبر نہیں کرسکے''۔[۱]

اس توضیح کے مطابق ہر متشابہ کو تفسیر کے علاوہ تاویل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ تفسیر اس کا ابہام دور کرتی ہے اور تاویل اس کے متشابہ ہونے کو رفع کرتی ہے۔ محکم آیات کو صرف تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ ان سے ابہام برطرف ہوجائے۔ بنابرایں تأویل تفسیر کی نسبت ''اخص مطلق'' ہے یعنی جہاں تاویل ہوگی وہاں تفسیر ضرور ہوگی کیونکہ تأویل بھی ایک طرح کی تفسیر ہے۔

متشابہات کی تاویل کا علم کسے ہے؟

سورۂ آل عمران کی ساتویں آیت کے ذیل میں ذکر ہوا ہے:

''وَ مَا یَعلَمُ تَأوِیلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُونَ فِی العِلمِ یَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهِ کُلٌّ مِن عِندِ رَبِّنَا وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الاَلبَابِ؛ حالانکہ اس کی تاویل کا علم صرف خدا کو ہے اور انھیں جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ سب کی سب (محکم و متشابہ) ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے ہے اور یہ بات سوائے صاحبان عقل کے کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے''۔

اس آیت شریفہ کے مطابق متشابہ آیات کے پوشیدہ حقائق پر دسترسی صرف خداوند متعال کی ذات اقدس میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان تک دستیابی علماء حقہ کیلئے بھی ممکن ہے۔ علماء حقہ ان آیتوں کے سمجھنے کیلئے الٰہی راستہ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں: کیونکہ تمام محکم اور متشابہ آیتوں کا منشا اور سرچشمہ ایک ہے لہذا ظاہر کے پس پردہ ایک ایسی حقیقت مخفی ہے جسے درک کرنا ضروری ہے اور جو کوشش کرتا ہے وہ پالیتا ہے۔ البتہ اس واقعیت کو صرف صاحبانِ عقل ہی سمجھتے ہیں۔

قرآن کے باطنی حقائق تک پہنچنے کی راہ کا بند ہونا (جن کو معارف الٰہی کے اسرار میں شمار کیا جاتا ہے) یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ فرض کریں اگر قرآن کریم میں کچھ ایسی آیتیں موجود ہوں جن کے متعلق کسی بھی مسلمان، عالم، دانشور، امام حتی پیغمبر اکرم ﷺ کو پوری طرح آشنائی نہ ہو تو اس سے اللہ تعالی کی حکمت لازماً زیرِ سوال آئے گی۔ کیونکہ جو کتاب بنی نوع انسان کیلئے ابدی ہدایت بن کر آئی ہے، کیسے ممکن ہے اس میں بعض مقامات پر ایسا ابہام پایا جائے جس کے رازوں سے کوئی بھی حتی پیغمبر اکرم ﷺ پردہ نہ اٹھا سکیں۔ ایسا فرض قطعاً محال اور حکمتِ الٰہی کے خلاف ہے۔

بنابرایں متشابہ آیتوں کے معانی اور باطنی حقائق تک دسترسی علماء حقہ کیلئے ممکن ہے۔ جملہ ''یَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهِ'' قوی اعتبار سے حال واقع ہوا ہے، جو ایمانِ محکم کو بیان کررہا ہے۔ یہی بات سبب بنتی ہے کہ علماء حقہ حکمتِ الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے متشابہ آیتوں کے پس پردہ مخفی حقائق تک دسترسی کی کوشش کرتے ہیں، وہ علم و دانش کے سائے میں ثابت قدم رہتے ہیں اور متشابہ آیتوں کے

---

۱) سورۂ کہف/آیت ۷۸

بارے میں ہرگز حیران و پریشان نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ معتقد ہیں کہ متشابہ اور محکم آیتوں دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کے پس پردہ بھی ایسے مطالب ہیں جو الفاظ کے ظاہر سے نمایاں نہیں ہورہے۔ اسی بنا پر وہ متشابہ آیتوں کی تاویل حاصل کرلیتے ہیں۔

متشابہ آیات کے نمونے

جیسا کہ بیان کرچکے ہیں قرآن مجید میں تشابہ کی دو قسمیں ہیں: اصلی تشابہ اور عرضی تشابہ۔ اب یہاں پر بطورِ نمونہ ان میں سے ہرایک کی مثال بیان کرتے ہیں۔[1]

تحیّز کی نفی (لامکانی)

تحیّز کے معنی ''فضا کو اپنے وجود سے پُر کرنا اور شش جہات (دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) میں سے کوئی خاص جہت رکھنا ہے۔ تحیز مادی موجودات کی خصوصیات میں سے ہے اور جسمانیت کا لازمہ ہے۔

''تحیّز'' پروردگار کی ذات کے منافی ہے کیونکہ خدا مجرد الوجود ہے۔ یعنی ایسا وجود ہے جو مادہ سے ماوراء اور جسم وجسمانیت کی تمام خصوصیات سے پاک ومنزّہ ہے۔

رئیس اشاعرہ ابوالحسن اشعری ''تحیّز'' کے قائل ہیں۔ وہ خدا کو اوپر (آسمانوں میں) صاحب مکان جانتے ہیں۔[2]

انہوں نے اپنے عقیدے کے اثبات کیلئے درج ذیل آیات سے استفادہ کیا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

وہ رحمان عرش پر اختیار واقتدار رکھنے والا ہے۔[3]

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ

وہ خدا آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے پھر یہ امر اس کی بارگاہ میں پیش ہوگا''۔[4]

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ

یہ سب اپنے پروردگار کی برتری اور عظمت سے خوفزدہ ہیں''۔[5]

---

۱) علوم قرآنی؛ص ۳۱۷۔ ۲۹۴

۲) التمہید؛ ج ۳،ص ۱۱۳۔ ۱۱۱ اور ۱۱۶۔ ۱۱۵/ الابانۃ؛ص ۲۸۔ ۲۶

۳) سورۂ طہٰ/آیت ۵

۴) سورۂ سجدہ/آیت ۵

۵) سورۂ نحل/آیت ۵۰

امامیہ اور معتزلہ نے محکم آیات میں سے آیت ''لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیءٌ'' [1] کے ذریعے خدا کو مخلوق کے ساتھ ہر قسم کی شباہت سے مبرّا جانا ہے۔ وہ ان مذکورہ آیتوں کی تاویل کرتے ہیں جنہیں ابوالحسن اشعری جیسے لوگوں نے متشابہ بنا دیا ہے اور کنایہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تفسیر کرتے ہیں۔یعنی اگر اللہ تعالی کیلئے کسی مقام کا تصور ممکن ہوتو وہ اس خاکی دنیا سے برتر اور بالاتر ہے کہ جہاں سے انسانوں پر سب برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور بندوں کے نیک اعمال اس کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں۔ وگرنہ اللہ تعالی کسی خاص جہت میں واقع نہیں ہے۔

''فَأَینَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجهُ اللہ؛ پس جدھر بھی رخ کرو اُدھر اللہ کی ذات ہے''۔ [2]

جن آیات کو اشاعرہ نے اپنے نظریے کے اثبات کیلئے بیان کیا ہے درحقیقت وہ محکم آیتوں میں سے تھیں۔ صدرِ اسلام میں عصرِ نزول کے مسلمان اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ اس کنایہ کو سمجھتے تھے۔لیکن بعد میں اشاعرہ نے اپنی اعتقادی اور مذہبی پشت پناہی کیلئے من گھڑت تفسیروں کی بنیاد پر انہیں متشابہ بنا دیا ہے۔اسی لیے ان آیتوں میں عرضی تشابہ پایا جاتا ہے۔

ارادہ اور اختیار

جیسا کہ تشابہ اصلی کی تعریف میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اس کے وجود میں آنے کا سبب معانی کی بلندی اور الفاظ کی نارسائی ہے۔وہ آیات جن میں اصلی تشابہ پایا جاتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے:

''وَمَا رَمَیتَ إِذ رَمَیتَ وَلٰکِنَّ اللہَ رَمٰی؛ اور (اے رسول) جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے اس وقت آپ نے نہیں اللہ نے کنکریاں پھینکی تھیں''۔ [3]

اس زمانے میں عرب اس آیت سے جبری مفہوم سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس آیت میں انسان کے اختیاری افعال (جو سب اذن الٰہی سے انجام پاتے ہیں) کے صادر ہونے میں دوسرے مؤثر عوامل کے مقابلے میں اس (انسان) کی ناچیز قدرت کی طرف اشارہ ہے۔عہد رسالتمآب ﷺ میں لوگوں کیلئے مذکورہ آیت سے یہ معنی سمجھنا سخت مشکل اور بہت دشوار تھا لہذا اس آیت میں تشابہ اصلی ہے۔

---

[1] سورۂ شوریٰ/آیت ۱۱

[2] سورہ بقرہ، آیت ۱۱۵

[3] سورۂ انفال/آیت ۱۷

سوالات

۱۔محکم اور متشابہ کی اصطلاحی تعریف بیان کریں؟

۲۔متشابہ آیات میں تشابہ سے کیا مراد ہے؟

۳۔قرآن کریم میں تشابہ کی اقسام ذکر کرتے ہوئے ان کی پیدائش کا سبب بیان کریں؟

۴۔تفسیر اور تاویل میں کیا فرق ہے؟

۵۔علمِ تاویل کا فقط خداوند متعال کی ذات سے خاص ہونا کیوں قابلِ قبول نہیں ہے؟ متشابہ آیات کی تاویل تک رسائی کن ہستیوں کیلئے ممکن ہے؟

۶۔متشابہ آیات میں سے کسی ایک آیت کو اس کے حقیقی معنی کے ساتھ بیان کریں؟

حروفِ مقطعات

قرآن کریم کی شناخت سے متعلق ایک اہم موضوع ''حروف مقطعات'' ہے۔قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں حروف تہجی کے ایک یا چند حروف پائے جاتے ہیں۔ یہ مجموعی طور پر ۷۸ حروف ہیں اور تکراری حروف کو حذف کرنے کے بعد ۱۴ حروف رہ جاتے ہیں (جو ۲۸ حروف تہجی کے نصف بنتے ہیں)۔وہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں واقع ہیں انہیں ''حروف مقطعہ'' کہا جاتا ہے، جن میں عظیم اسرار پوشیدہ ہیں۔ اگرچہ حروف مقطعہ کو لکھنے کے دوران آپس میں ملا کر ایک کلمے کی صورت میں لکھا جاتا ہے لیکن پڑھتے وقت ہر حرف کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اس کے عربی تلفظ میں پڑھا جاتا ہے۔ جیسے :''المص'' کو یوں پڑھا جاتا ہے''الف ،لام ،میم ، صاد''۔

چودہ حروف یہ ہیں: ''ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ہ، ی''۔

بدرالدین زرکشی نے ان حروف کی ترکیب سے جملہ'''نص حکیم قاطع لہ سر''اور مرحوم فیض کاشانی نے یہ جملہ''صِرَاطُ عَلِیٍ حَقٌ نُمسِکُہٗ''بنایا ہے۔

حروفِ مقطعہ کے متعلق مختلف نظریات

حروف مقطعات کے متعلق بہت زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔مختلف آراء اور نظریات کا اظہار کیا گیا ہے۔ غالباً اس بارے میں بیس (۲۰) سے زیادہ نظریات پائے جاتے ہیں جنہیں فخر رازی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔لیکن بنیادی طور پر یہ اقوال تین گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔

۱۔حروف مقطعات قرآن مجید کے متشابہات میں سے ہیں جو ہرگز قابل حل نہیں ہیں اور مطلق مجہولات میں سے ہیں لوگوں پر ان کی حقیقت جاننے کا راستہ مکمل طور پر بند ہے۔اہل کلام نے اس عقیدے کی مذمت کی ہے اور قرآن مجید میں ایسی مطلق جہالت کہیں بھی قابل قبول نہیں ہے کہ جس کی پیغمبرؐ اور دوسرے اولیائے خدا کو بھی خبر نہ ہو۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جو کتاب مبین (آشکار) جیسے اوصاف سے مزیّن ہو اس میں ایسی چیز پائی جائے جو کاملاً پوشیدہ ہو۔

۲۔حروف مقطعات خدا اور رسولؐ کے درمیان ایسے اسرار و رموز ہیں جنہیں فقط اولیائے الٰہی ہی جانتے ہیں۔

''لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؛اسے پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا''۔[۱]

اربابِ ذوق کہتے ہیں:''اشارہ وکنایہ میں گفتگو کرنا احباب کا شیوہ ہے جسے وہ دوستانہ میل جول میں بروئے کار لاتے ہیں۔ ان رموز کے ذریعہ وہ محبوب کو باخبر اور رقیب کو بے خبر رکھتے ہیں۔

سید رضی الدین بن طاؤس (متوفی ۶۶۴) نے ابو عبد الرحمان محمد بن الحسین سُلمی (متوفی ۴۱۲) کی کتاب ''حقائق التفسیر'' سے حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت بیان کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

''الم'' خدا اور اس کے حبیب حضرت محمد ﷺ کے درمیان ایک رمز و اشارہ ہے خدا نے چاہا اس کے حبیب کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہ ہو۔ اس لیے ان کو حروف کی شکل وصورت میں ذکر کیا تا کہ ان رموز کو غیروں کی نظر سے دور رکھے اور فقط اپنے محبوب پر ظاہر کرے۔[۲]

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ (متوفی ۳۹۱) کہتے ہیں:

''بعض سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعہ کے نازل ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کی شناخت صرف اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ تا کہ اُن حروف کے ذریعے دلائل، حجت اور برہان قائم کریں اور ان کے ہاتھ سے معجزات ظاہر ہوں۔ اگر ان کی شناخت سب کیلئے میسّر ہوتی تو یہ بات خلافِ تدبیر وحکمت ہوتی۔[۳]

اکثر صاحب نظر حضرات کا یہی عقیدہ ہے کہ انھوں نے حروف مقطعہ کو ایسے اسرار و رموز جانا ہے جن کو فقط اولیاء الٰہی ہی سمجھ سکتے ہیں۔عربوں میں بھی یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ بھی رمز اور اشارے سے گفتگو کرتے تھے۔[۴]

۳۔حروف مقطعات فقط خالی حروف ہیں، جن میں صرف صوتی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ نہ یہ رمز اور اشارہ ہیں اور نہ ہی صوتی خاصیت کے علاوہ کوئی معنی رکھتے ہیں سورتوں کے شروع میں ان حروف کو لانے کی حکمت الفاظ اور آواز کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔

بعض نے کہا ہے:''آدھے حروف تہجی اس لیے لائے گئے ہیں تا کہ ''عربوں کو چیلنج'' کیا جائے کہ اگر تم سچ کہتے ہو کہ یہ بشر کا کلام ہے اور ان ہی مرکب شدہ حروف سے تشکیل پایا ہے تو تم بھی آدھے حروف اور بڑھا لاؤ اور اس طرح کا کلام لے آؤ''۔

دوسروں نے کہا ہے:''اس زمانے میں قرآن مجید کی تلاوت کے دوران ان حروف کی آواز حاضرین کو متوجہ کرنے کا باعث

---

۱) سورہ واقعہ/آیت ۷۹

۲) سعد السعود؛ص ۲۱۷ مطبوعہ نجف

۳) کمال الدین؛ج ۲،ص ۶۴۰

۴) التمہید ؛ج ۵،ص ۳۱۵۔۳۱۰ تفسیر المیزان ؛ج ۱۸،ص ۹

بنتی تھی تا کہ وہ قرآن کو دھیان سے کان لگا کر سنیں۔ کیونکہ دشمن ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ شور مچائیں تا کہ قرآن مجید کی آواز کسی راہ گزرنے والے کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔

''لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَ الۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ؛ اس قرآن کو ہرگز مت سنو! اس کی تلاوت کے وقت ہنگامہ کرو شاید اس طرح ان پر غالب آجاؤ''۔[1]

کچھ نے ان حروف سے ''قسم'' مراد لیتے ہوئے کہا ہے:

''خداوند متعال نے تین (انجیر)، زیتون، شہر مکہ وغیرہ کی مانند ان حروف کی بھی قسم کھائی ہے۔ اُن کے بقول: خداوند متعال نے ان حروف کی قسم اس لیے کھائی ہے کیونکہ تمام زبانوں میں کلام کا دارومدار حروف پر ہوتا ہے''۔

علامہ طباطبائیؒ نے سورۂ شوریٰ کی تفسیر میں ان حروف کے متعلق فرمایا ہے:

''اگر ''الم، الر، طس، اور حم'' وغیرہ جیسے حروفِ مقطعہ سے آغاز ہونے والی سورتوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مفہوم اور موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ان کا سیاق بھی یکساں ہے۔ لہٰذا یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ان حروف مقطعہ اور متعلقہ سورتوں کے مفہوم کے درمیان ایک خاص رابطہ پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ اعراف کی ابتدا ''المص'' سے ہوتی ہے۔ شاید یہ سورت ''الم'' والی سورتوں اور سورۂ ''ص'' کے مفہوم کے درمیان جامع ہو۔ اسی طرح سورۂ رعد کی ابتدا ''المر'' کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس لیے شاید ''الم'' والی سورتوں اور ''الر'' کے مفہوم کو شامل ہو اور اسی طرح دیگر سورتیں ہیں۔

لہٰذا اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ حروف شاید خدا اور رسولؐ کے درمیان رموز اور اشارے ہیں جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں اور ہم اس قسم کے تعلق سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتے۔ البتہ ممکن ہے دوسرے لوگ اس بات سے بہتر سمجھ لیں۔ شاید حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ''ہر کتاب کا خلاصہ ہوتا ہے اور اس کتاب (قرآن) کا خلاصہ حروف تہجی ہیں جو سورتوں کے اوائل میں واقع ہیں''۔[2]

ہمارے نزدیک حروف مقطعات کے بارے میں دوسرا نظریہ مقبول ہے یعنی یہ حروف خدا اور رسولؐ کے درمیان ایسے اسرار اور رموز ہیں جن سے حاملان وحی آگاہ ہیں اور اگر دوسروں کا اس سے آگاہ ہونا ممکن ہوتا تو شروع سے ہی رمز کی صورت میں نہ آتے۔

البتہ ممکن ہے ان حروف کے کئی دوسرے آثار اور فوائد بھی ہوں جیسا کہ علامہ طباطبائیؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ شاید یہ مختلف نظریات ان حروف میں پوشیدہ اسرار کی ایک جھلک ہوں۔ لہٰذا جیسا بھی ہو یہ حروف مقطعہ قرآن مجید کے معجزات میں سے عظیم معجزہ شمار ہوتے ہیں جو ہمیشہ کیلئے اپنے اندر بہت سے اسرار و رموز سموئے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں دوسرے افراد ان سے بہترین فوائد حاصل کریں۔

---

۱) سورۂ فصلت/آیت ۲۶

۲) تفسیر المیزان: ج ۱۸، ص ۶

سوالات

۱۔حروفِ مقطعات کسے کہتے ہیں؟ کتنی سورتوں کے آغاز میں ذکر ہوئے ہیں اور انہیں کیسے پڑھا جاتا ہے؟

۲۔حروفِ مقطعات کے متعلق نظریات مجموعی طور پر کتنے گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں ان کی وضاحت کریں؟

۳۔حروفِ مقطعات کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول روایت لکھیں؟

سولہواں سبق

قرآنی قصّے

وعظ ونصیحت پر مشتمل کلام کتنا ہی فصیح وبلیغ کیوں نہ ہو بہر حال خشک وروکھا کلام ہوتا ہے اور مخاطبین کیلئے تھکن، اکتاہٹ اور بوریت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کیلئے قصہ وداستان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قصے اور داستان، کلام کو یکسانیت اور روکھے پن سے نکال کر پُرکشش بناتے ہیں اور سامعین کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے تلخ وشیرین تجربات بیان کرتے ہیں اور انسانوں کی ترقی وکمال کا باعث بنتے ہیں:

''فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ؛ تو اب آپ ان قصوں کو بیان کریں شاید یہ غور وفکر کرنے لگیں''۔[1]

قرآنی قصوں سے مراد حقیقت پر مبنی ایسی روداد کا بیان ہے جسے بشریت آزما چکی ہے اور اس کے تلخ وشیرین تجربات کا مزہ بھی چکھ چکی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہے:

''نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَقِّ؛ ہم آپ کو ان کے واقعات حقائق پر مبنی بالکل صحیح اور سچے بتارہے ہیں''۔[2]

قرآن کریم میں قصوں کا ذکر اچھائیوں اور برائیوں کی حقیقت بیان کرنے کیلئے کیا گیا ہے تاکہ اچھائیاں ہمیشہ کیلئے نمونۂ عمل بن جائیں اور برائیوں سے دوری اختیار کی جاسکے۔ عبرت آموز قرآنی قصوں میں خیال پردازی کا عنصر نہیں پایا جاسکتا۔ چونکہ کوئی بھی داستان اس وقت عبرت آموز ہوسکتی ہے جب وہ حقیقت پر مبنی ہو اور اس میں کسی بھی طرح کا تخیلاتی عنصر نہ پایا جاتا ہو۔ کیونکہ تخیلات نہ تو اچھائیوں اور برائیوں کی حقیقی شکل پیش کرسکتے ہیں اور نہ ہی ان کیلئے مضبوط سند کے عنوان بیان کیے جاسکتے ہیں۔

قرآنی قصوں کی خصوصیات

ا۔ قصوں کا انتخاب

قرآن کریم، تاریخی یا افسانوی کتاب نہیں بلکہ صرف ہدایت کی کتاب ہے۔ جس میں تاریخ بشریت میں رونما ہونے والے

---

۱) سورۂ اعراف/آیت ۱۷۶

۲) سورۂ کہف/آیت ۱۳

اچھے اور بُرے واقعات کونصیحت اور عبرت آمیز کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔لہذا قرآنی قصوں میں ضرورت کے مطابق پیغامِ ہدایت پر مشتمل حصے ہی کے بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔لہذا اس میں کوئی بھی داستان مکمل طور پر ذکر نہیں ہوئی ہے بلکہ کلام کے اصلی ہدف سے مربوط منتخب حصہ بیان ہوا ہے۔لہٰذا مروّجہ ادبی قصوں کے برخلاف قرآن کریم کے قصے اپنے عناصر،اہداف اور پیغام میں زیادہ متاثر کنندہ ہیں ان سے صرف اتنا ہی استفادہ کیا گیا ہے جتنا ہدف اور پیغام رسانی میں مفید تھا۔مثلاً متعدد قصوں میں اشخاص کے نام تک ذکر نہیں ہیں جیسے اصحاب کہف،اصحاب فیل،زوجۂ فرعون،مادرِ موسیٰؑ وغیرہ۔درحقیقت افراد کا نام ضرورت ہی کے مطابق ذکر ہوا ہے جیسے حضرت مریمؑ لیکن جہاں پر نام ہدف میں مؤثر نہیں،وہاں نام کی بجائے ایسی صفت بیان ہوئی ہے جو ہدف پورا کرے یا نام سے چشم پوشی کرتے ہوئے پوری توجہ صرف ہدف پر مرکوز رکھی ہے۔اس کی بہترین مثال قومِ ثمود کی داستان ہے کہ جو سورۂ والشّمس میں ذکر ہوئی ہے:

''كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۪ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۪ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا وَ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ؛ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر رسول کو جھٹلایا جب ان کا بدبخت اُٹھ کھڑا ہوا تو خدا کے رسول نے کہا کہ خدا کی اونٹنی اور اس کی سیرابی کا خیال رکھنا تو ان لوگوں نے اس کی تکذیب کی اور ٹانگیں کاٹ ڈالیں تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کر دیا اور انہیں بالکل برابر کر دیا اور اسے اس کے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے''۔[1]

اس قصے کا اصل ہدف،رسالت اور اس کی نشانی (اونٹنی) کا جھٹلایا جانا ہے۔لہذا اس کا انداز بیان اور سیاق کا محور یہی ہے اور قصے کے عناصر بھی اسی غرض کے بیان پر مرکوز ہیں۔اس قصے میں قوم ثمود کا نام مذکور ہے جبکہ اس کی اصل شخصیت و کردار حضرت صالحؑ کو'' رسول اللّٰہ'' کے نام سے اور اس کی منفی شخصیت و کردار کو''أَشْقَاهَا'' سے تعبیر کیا ہے اور قصے کے تمام عناصر وارکان ہدف کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔[2]

۲۔بیانِ حقیقت

قرآنی قصے ادبی لحاظ سے حقائق شمار ہوتے ہیں۔جن میں خیال پردازی کا عنصر بالکل نہیں پایا جاتا کیونکہ وہ ''حق'' ہیں:

''نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؛ہم آپ کو ان کے واقعات بالکل سچے سچے بتا رہے ہیں۔''[3]

اسی لیے قرآنی قصوں میں مذکور عجیب وغریب واقعات مکمل حقیقت پر مبنی ہیں۔چاہے انہیں معجزہ شمار کیا جائے جیسے عصائے موسیٰؑ اور دمِ عیسیٰؑ اور چاہے انہیں حیرت انگیز واقعات شمار کیا جائے جیسے حضرت موسیٰؑ کے سفر کے واقعات اور حضرت عزیرؑ کی سو سالہ نیند کا مسئلہ ہو یا اصحاب کہف کی تین سو سالہ نیند کا مسئلہ۔

---

[1] سورۂ شمس/آیت ۱۵۔۱۱

[2] مزید معلومات کے لیے؛علوم قرآنی؛ص ۲۷۵۔۲۷۴

[3] سورۂ کہف/آیت ۱۳

۳۔ تعلیم اور تربیت

گذشتہ دو خصوصیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے سرگرمی اور مشغولیت کیلئے یا زمانہ جاہلیت کے عربوں کی توجہ مبذول کرنے کیلئے داستان سرائی نہیں کی ہے۔ بلکہ قرآنی قصوں کے اپنے مقدس اہداف ہیں۔ جن میں سے اہم ترین ہدف انسانوں کی تعلیم اور تربیت ہے۔

قرآنی قصوں کے اہداف

قرآنی قصوں کے متعدد اہداف ہیں۔ عظیم مفسر سید قطبؒ نے ان کے درج ذیل کچھ اہداف ذکر کیے ہیں:

ا۔ حضرت محمد ﷺ کی رسالت اور وحی کا اثبات

پیغمبر اکرم ﷺ نے نہ تو کسی سے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی آپ کو علماء اور دانشوروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھا گیا۔ لیکن جب آپ عظیم الشان داستانیں بیان کرتے جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے حالات و واقعات بڑے دقیق اور مفصل بیان کرتے تھے۔ حالانکہ ایسے شخص کے پاس اتنی گہری اور دقیق معلومات کا ہونا ناممکن ہے جس نے نہ تو کسی سے پڑھا اور نہ ہی اس کا علم و دانش کے ساتھ کوئی سابقہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے حیرت انگیز قصے اس کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہیں جسے خود قرآن کریم نے بالکل واضح طور پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف کے آغاز میں ذکر ہوا ہے:

"اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ★ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ؛ ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔ ہم اس قرآن کو آپ کی طرف وحی کر کے آپ سے بہترین قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور آپ اس سے پہلے (ان واقعات سے) بے خبر تھے"۔[1]

یہ آیت اس بات پر تاکید کرتی ہے کہ "آپ ان واقعات کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں جانتے تھے اور ہم وحی کے ذریعے آپ کو ان کے بارے میں مطلع کرتے ہیں"۔ یہی تو قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ دین کی اساس اور بنیاد وحی الٰہی

دین بطور کامل وہی ہے جسے حضرت نوحؑ کے زمانے سے لیکر عہدِ رسالتمآبؐ تک خداوند متعال کی جانب سے پیش کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ تمام انبیاء کرام کی امتوں کا پروردگار ہے۔ سورۂ انبیاء کی آیات ۷۴ تا ۹۲ سے یہ بات واضح ہے کہ گذشتہ انبیاء کرامؑ کی تمام زندگی ایک خاص مقصد کیلئے ہے، سب ایک ہی راہ پر چل رہے ہیں، ایک ہی بات کہہ رہے ہیں اور تمام امتیں در حقیقت امتِ واحدہ ہیں۔

۱) سورۂ یوسف / آیت ۳-۲

۳۔انبیاء کرام علیہم السلام کا یکساں طریقہ تبلیغ

انبیاء کرام ایک راہ پر چلتے ہوئے ایک ہی مقصد تک پہنچے ہیں۔ان کے مقابلے میں دشمنانِ دین کا ردعمل بھی تمام ادوار میں یکساں تھااور انبیاء کرامؑ سے مقابلےاور دشمنی کی روش بھی ایک جیسی تھی۔[1]

۴۔ادیان ابراہیمی کے مشترکات

تمام الٰہی شریعتوں اور بالخصوص اسلام کی مقدس شریعت کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت پر ہے۔اتنا قریبی رابطہ صرف ادیان ثلاثہ (یہودیت، مسیحیت، اسلام) اور حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں پایا جاتا ہے جبکہ دوسرے ادیان میں ایسا نہیں ہے۔حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قصوں میں اس مطلب کی طرف متعدد بار اشارہ ہوا ہے۔

إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولٰى صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسٰى

یہ بات تمام پہلے صحیفوں میں موجود ہے ابراہیم کے صحیفوں میں بھی اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔[2]

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ

یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس (قرآن) سے پہلے۔[3]

’’وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ؛ اور ان کے بعد ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب توریت کی تصدیق کرتے ہیں اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور تھا جو اپنے سے پہلے والی کتاب توریت کی تصدیق کرتی تھی اور اہل تقوی کیلئے ہدایت اور نصیحت تھی‘‘۔[4]

۵۔انبیاء کرام علیہم السلام کی نصرت نہ کرنے والوں اور ان کے جھٹلانے والوں کیلئے ہلاکت ہے

ایسے قصے پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے تسکین قلب اور اہل حق کے لیے آسودگی خاطر کا باعث تھے۔

’’وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ؛ اور (اے رسول) ہم پیغمبروں کے وہ تمام قصے آپ کو بتاتے ہیں جن سے ہم آپ کو ثبات قلب دیتے ہیں اور ان کے

---

[1] مزید معلومات کیلئے: علوم قرآنی، ص ۲۷۸

[2] سورۂ اعلیٰ / آیت ۱۹۔۱۸

[3] سورۂ حج / آیت ۷۸

[4] سورۂ مائدہ / آیت ۴۶

ذریعے حق بات آپ تک پہنچ جاتی ہے نیز مومنین کیلئے نصیحت اور یاد دہانی ہوجاتی ہے''۔[۱]

۶۔بشارت اور انذار کی صداقت پر دلیل

گذشتہ لوگوں کی سرگذشت اور انجام، انبیاء کرامؑ کے وعدوں اور وعیدوں کے سچے ہونے کی دلیل ہے۔

''نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ، وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ؛(اے رسول) میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑادرگزر کرنے والا، مہربان ہوں اور میرا عذاب بھی یقینا دردناک عذاب ہے''۔[۲]

۷۔صالح بندوں بالخصوص انبیاء و اوصیاء کرام علیہم السلام پر خداوند متعال کی خاص عنایتوں کا بیان

شاید ان کی سرگذشت کے بیان کرنے کا اصلی مقصد یہی ہو کہ خداوند متعال کے نیک اور صالح بندے خود کو ہمیشہ عنایت الٰہی کے سایہ میں سمجھتے ہوئے ذہنی و قلبی طور پر سکون و آرام سے رہیں: ''اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّ مِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْرَآءِیْلَ وَ مِمَّنْ هَدَیْنَا وَ اجْتَبَیْنَا؛ یہ وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا جو اولاد آدم میں سے ہیں اور ان میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں اٹھایا اور ابراہیم و اسماعیل کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا''۔[۳]

لہذا اس بات پر خداوند متعال کی تاکید ہے کہ ہمیشہ ان سے متمسک رہیں تاکہ اس کا لطف و عنایت ان کے بھی شامل حال ہو جائے: ''وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا، ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ عَلِیْمًا؛ اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں یہ فضل اللہ ہی کی طرف سے ملتا ہے اور علم و آگاہی کیلئے تو اللہ ہی کافی ہے''۔[۴]

۸۔انسان کو یاد دہانی کروانا مبادا وہ شیطان کی چال میں نہ آجائے

انسان اور شیطان کے درمیان دشمنی دائمی اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔لہذا حضرت آدم علیہ السلام کی داستان کا مقصد بھی

---

۱) سورہ ھود/آیت ۱۲۰

۲) سورۂ حجر/آیت ۵۰-۴۹

۳) سورۂ مریم/آیت ۵۸

۴) سورۂ نساء/آیت ۷۰-۶۹

یہی یاددہانی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں متعدد بار ہوا ہے۔[1]

مجموعی طور پر قصوں کے درج ذیل اہداف سامنے آتے ہیں:

ا۔غیر مستقیم طریقے سے تعلیم وتربیت۔

ب۔عبرت آموزی اور غور وفکر۔

ج۔حقائق کی تبیین اور صحیح دینی فکر کا احیاء(خرافات کو مٹاتے ہوئے)۔

د۔نبوت کے سچے ہونے کی گواہی اور تبلیغ اسلام کی نشر واشاعت کیلئے ماحول کی فراہمی۔

ھ۔پیغمبر اکرم ﷺ کی تسکین اور مومنین کے دلوں میں امید پیدا کرنا(کامیابی کی نوید دے کر)۔

قرآنی قصوں کے تکرار کا راز

قرآن کریم میں قصوں کا تکرار مختلف انداز میں ہوا ہے اور جو مختلف اہداف کی بنا پر ہے۔ ہر انداز بیان میں نئی حکمت پائی جاتی ہے۔مثلاً فقر وتنگدستی کے ڈر سے اولاد کے قتل نہ کرنے کے بارے فرمایا:''وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ؛اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔''[2]

ایک اور سورہ میں فرمایا:''وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؛اور اپنی اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو کہ ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی رزق دیتے ہیں۔''[3]

پہلی آیت میں اولاد کا بیان بعد میں اور دوسری آیت میں مقدم ہے۔اس طرح ذکر کیے جانے کا راز یہ ہے کہ پہلی آیت میں موجود فقر وتنگدستی سبب بنی ہے کہ وہ اپنی اولاد قتل کریں۔لہذا خداوند متعال اس بات کی یقین دہانی کرا رہا ہے ابھی تمہاری روزی اور مستقبل میں تمہاری اولاد کی روزی خدا ہی کے ذمہ ہے۔لہذا تم اور تمہاری اولاد دونوں خدا ہی کے نمک خوار ہو۔لیکن دوسری آیت میں انہیں اس بات کا خوف ہے کہ بچوں کے اخراجات کا ذمہ اٹھانے کی بنا پر کہیں وہ مستقبل میں فقر وتنگدستی کا شکار نہ ہو جائیں۔لہذا خداوند متعال انہیں اس بات کا اطمینان دلا رہا ہے کہ تمہارے بچوں کے رزق وروزی کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے کہ جو تمہاری فقر اور تنگدستی کا سبب بنے۔بلکہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی روزی بھی خدا ہی کی طرف سے ہے۔[4]

---

[1] مزید معلومات کیلئے: الفن القصصی فی القرآن،ص ۲۲۶ر''التصویر الفنی فی القرآن''ص ۱۱۲۔۱۲۰رتفسیر کبیر رازی؛ ج ۱۷،ص ۱۳۵

[2] سورۂ انعام رآیت ۱۵۱

[3] سورۂ بنی اسرائیل رآیت ۳۱

[4] اسرار الحکر ار فی القرآن؛ص ۷۵،نمبر شمارہ ۱۱۵

سوالات

۱۔ کیا قرآنی قصے افسانوی ہیں؟

۲۔ قرآنی قصوں کی خصوصیات بیان کریں؟

۳۔ قرآنی قصوں کے مرکزی اہداف کیا ہیں؟ ان اہداف کو ذکر یں۔

۴۔ ''ادیان ابراہیمی کے مشترکات'' (قرآنی قصوں کا ایک ہدف ہونے کے عنوان سے) آیت کے ساتھ وضاحت بیان کریں؟

۵۔ ان دو آیتوں ''وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ'' (سورۂ انعام/آیت ۱۵۱) اور'' وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ'' (سورۂ بنی اسرائیل/آیت ۳۱) کی تکرار میں کیا حکمت ہے؟

قرآنی قَسمیں

قَسم ایسی تاکید ہے جو کسی مطلب کی اہمیت بتلانے کے لیے ہے۔ لیکن اس کا استعمال ایسے موارد میں ہوتا ہے جہاں کسی اہم کام کے بیان کے لیے چند برابر اور بہت زیادہ تاکید کی ضرورت ہو اور حروف تاکید متعلقہ کام کی شدید اہمیت صحیح معنوں میں بیان کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ قرآن کریم میں بھی عربوں کے اسلوبِ کلام کے مطابق اسی روش سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ایسی چیز کی قَسم کھائی جاتی ہے جو خود ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ سامعین کی توجہ کا محور قرار پائے۔ قَسم حقیقت میں ایک طرح کی تشبیہ ہے۔ جس طرح ''مُقسَم بہٖ'' (جس کی قسم کھائی جاتی ہے) ثابت، پائیدار اور قابل قبول ہوتا ہے بالکل اسی طرح ''مُقسَم علیہ'' (جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے) بھی ثابت، پائیدار اور سب کیلئے قابل قبول ہوتا ہے۔ لہٰذا قَسم نہ صرف تاکید اور تشبیہ سے مرکب ہے بلکہ ''مُقسَم بہ اور مُقسَم علیہ'' کی اہمیت بھی واضح کرتی ہے۔

قسم کے ارکان

قسم درج ذیل چار عناصر پر مشتمل ہے: ۱۔ مُقسَم بہ ۲۔ مُقسَم علیہ ۳۔ حروفِ قَسم ۴۔ حروفِ جواب قَسم

۱۔ مُقسَم بہ (جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے)

انسانوں کی گفتگو میں مُقسَم بہ خداوند متعال کی ذات اور الٰہی صفات ہیں اور کبھی ایک دوسرے کی جان کی قسم بھی اٹھاتے ہیں۔ جیسے ''تیری قسم'' یا ''میری جان کی قسم''، لیکن جس قَسم پر شرعی احکام نافذ ہوتے ہیں وہ فقط خداوند متعال کی ذات اور اس کی صفات کی قَسم ہے۔

۲۔ مُقسَم علیہ (جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے)

ہر وہ اہم کام جس کے لیے چند برابر اور بہت زیادہ تاکید کی ضرورت اور اس کیلئے قَسم اٹھائی جائے۔

۳۔حروف قسم

وہ حروف جو قَسم کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔عربی زبان میں ان کی تعداد چار (۴) ہے۔جو یہ ہیں: باء،واؤ،تاء اور لام۔

قرآن کریم میں حروفِ قَسم کے عنوان سے واؤ،تاء اور لام کا ذکر متعدد بار ہوا ہے۔اگرچہ حروف قَسم میں اصلی حرف ''باء'' ہے لیکن اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہوا۔

۴۔حروفِ جواب قَسم

ایسے حروف جو جوابِ قَسم پر داخل ہوتے ہیں اور مقسَم علیہ کو معین کرتے ہیں۔وہ درج ذیل پانچ حروف ہیں:

''لام مَفتُوحَہ،اِنَّ مُشَدِّدَہ مَکسُورَہ، لَاءِ نَافِیہ، مَاءِ نَافِیہ اور اِنْ مُخَفَّفہ نافیہ''۔

قرآنی قَسموں کی تقسیم

قرآنی قَسموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔صریح ۲۔منفی ۳۔تقدیری

۱۔صریح قَسمیں

ایسی قسم جس کے تمام عناصر واضح طور پر ذکر ہوں یعنی اس میں پہلے حرفِ قسم پھر مقسَم بہ اور اس کے بعد مقسَم علیہ بیان ہوا ہو تو وہ ''صریح قسم'' کہلاتی ہے۔اکثر قرآنی قسمیں صریح ہیں۔قرآن کریم کی انتیس (۲۹) سورتوں میں اکیاسی (۸۱) مرتبہ بالکل واضح اور صریح طور پر قسم ذکر ہے۔[۱]

یہاں پر صرف تین موارد بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔''نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ؛ ن قلم اور اس چیز کی قسم جو یہ لکھ رہے ہیں! آپ اپنے پروردگار کی نعمت کے طفیل مجنون نہیں ہیں''۔[۲]

۲۔''قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ؛ان لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم! تمہیں تو معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد کرنے کیلئے نہیں آئے ہیں''۔[۳]

---

۱) علوم قرآنی،ص ۲۹۸۔۲۹۷

۲) سورہ قلم/آیت ۲۔۱

۳) سورہ یوسف/آیت ۷۳

نکتہ: اگر لامِ جوابِ قسم، فعل ماضی مثبت پر داخل ہوتو اسے ''قد '' کے ساتھ لانا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں بالکل ایسے ہی ''لقد علمتم '' ذکر ہوا ہے۔

۳۔ ''لَعَمْرُکَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَکْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ؛

(اے رسول) آپ کی زندگی کی قسم! یقیناوہ بدمستی میں اندھے ہورہے ہیں''۔[۱]

پہلی آیت میں حرفِ واو کے ساتھ ''قلم'' دوسری آیت میں حرفِ تاء کے ساتھ ''اللہ'' اور تیسری آیت میں لامِ مفتوحہ کے ساتھ ''پیغمبر اکرم ﷺ'' (یا کسی ایک نبی) کی قسم کھائی گئی ہے۔

۲۔ منفی قسمیں

ایسی قسم جو حرفِ نفی ''لا '' کے ساتھ بیان کی گئی ہو وہ ''منفی قسم'' کہلاتی ہے۔ جیسے:

''لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ''میں روز قیامت کی قسم کھاتا ہوں''۔[۲]

اکثر مفسرین کی نگاہ میں منفی قسموں میں حرفِ نفی ''لا '' زائدہ یا اضافی ہے۔ ان آیات کے معنی حرفِ لاء حذف کر کے سمجھنے چاہییں، مثلاً آیت ''فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ [۳] فَاُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْم ہے اور لاء زائدہ تاکید کیلئے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی قسموں میں حرفِ نفی ''لا '' زائد نہیں ہے اور خداوند متعال نے قسم کی عظمت بیان کرنے کیلئے قسم نہیں کھائی جیسا کہ یہ آیت:

''فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ؛ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ؛

میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی اور اگر تم سمجھو تو یقینا بہت بڑی قسم ہے''۔[۴]

اسی لیے حرفِ لاء صرف ''بِمَوَاقِعِ النُّجومِ؛ یعنی ستاروں کے مقام'' کے لحاظ سے قسم کی نفی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس سے مراد یہ ہے کہ مقسَم بہ (بِمَوَاقِعِ النُّجومِ) کی قسم اٹھا کر ان کی عظمت بیان کرنا حقیقت میں انہیں کم اہمیت سمجھنا ہے یعنی ان کا مقام اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اس کی قسم اٹھائی جائے۔ لہٰذا حرفِ لاء کے ساتھ ظاہری طور پر قسم کو منفی شکل میں ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس طرح ستاروں کے مقام کی عظمت بیان کی جائے۔[۵]

قرآن کریم میں منفی قسموں کی تعداد پندرہ (۱۵) ہے جن کا ذکر چھ (۶) مختلف سورتوں میں ہے۔[۶]

---

۱) سورہ حجر/آیت ۷۲

۲) سورۂ قیامت/آیت ۱

۳) سورہ واقعہ/آیت ۷۵

۴)) سورہ واقعہ/آیت ۷۵۔ ۷۶

۵) تفسیر کشاف؛ جلد ۴، ص ۶۵۹۔ ۶۵۷

۶) علوم قرآنی/ص ۲۹۹

۳۔ تقدیری قسمیں

تقدیری قسموں کے متعلق گفتگو کرنے سے پہلے "لام موطئہ" کے بارے جاننا ضروری ہے۔ابن ہشام اپنی مشہور کتاب ''مغنی اللبیب''میں لکھتے ہیں: وہ لام جو کبھی' ان شرطیہ' پر داخل ہوتی ہے اسے "لام موطئہ" کہتے ہیں۔تا کہ اس بات کی وضاحت کرے کہ بعد والا جملہ'' قسم کا جواب'' ہے نہ کہ شرط کی جزا۔''واللہ لئن اتیتنی لاتینک''۔جیسا کہ اس مثال میں اس بات کا تعین کر رہی ہے کہ''لاتینک''''قسم''واللہ'' کا جواب ہے تا کہ وہ جوابِ شرط سے مل نہ جائے (اور کوئی اشتباہاً اسے جواب شرط نہ سمجھ لے)۔کیونکہ عربی گرائمر کے مطابق جب بھی حرفِ شرط پر لام موطئہ داخل ہو تو جوابِ شرط کا حذف کرنا واجب ہو جاتا ہے۔[1]

کبھی یہ قسم (جو حرفِ شرط سے پہلے ہوتی ہے) اسے تقدیر میں مفروض سمجھا جاتا ہے۔قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر ایسا ہوا ہے۔بطور مثال:

''لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ؛ اگر نکال بھی دئے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ہرگز ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر مدد کریں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر ان کی کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔''[2]

کیونکہ اس آیت کے تینوں جملوں میں لئن سے پہلے مقسم بہ (واللہ؛ جس کی قسم اٹھائی گئی ہے) مقدر ہے،لہذا ایسی قسموں کو تقدیری قسمیں کہا جاتا ہے۔قرآن کریم میں اکسٹھ (۶۱) مقامات پر لامِ موطئہ کا ذکر ہوا ہے کہ جہاں پر قسم تقدیری ہے۔

مثال کے طور پر:''وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ؛ ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے عطا کر دے گا تو اس کی راہ میں صدقہ دیں گے''[3]

مذکورہ آیت میں معاہدہ عبارت''لئن اتانا'' کے ذریعہ ہوا ہے جبکہ قسم (واللہ) مقدر ہے۔

نکتہ: کبھی تقدیری قسم لامِ موطئہ کے بغیر بھی آتی ہے۔جیسے:

''وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ؛ اور اگر تم لوگوں نے ان کی اطاعت کر لی تو تمہارا شمار بھی مشرکین میں ہو جائے گا''۔[4]

اس آیت کی تقدیر یوں ہے: واللہ لَئِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ۔جس میں جملہ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ تقدیری قسم (واللہ) کا جواب ہے۔

---

۱) مغنی اللبیب/ص ۱۲۲

۲) سورہ حشر/آیت ۱۲

۳) سورہ توبہ/آیت ۷۵

۴) سورہ انعام/آیت ۱۲۱

قرآن کریم میں قسم کے موارد

جس چیز کی قسم اٹھائی جاتی ہے (یعنی مقسَم بہ) اسے ثابت اور پائیدار ہونا چاہیے تاکہ جس کے متعلق قسم اٹھائی جارہی ہے (یعنی مقسَم علیہ) اس کیلئے کئی گنا زیادہ تاکید کا باعث بن سکے۔ انسانوں کے کلام میں مقسَم بہ خداوند متعال کی ذات، اس کی صفات، مقدس مقامات اور ایک دوسرے کی جان کی قسم ہوتی ہے۔ جبکہ قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر مختلف موجودات کی قسم اٹھائی گئی ہے۔ جنہیں یہاں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۱۔خداوند متعال جلّ شانہ کی قسم

قرآن کریم میں خداوند متعال جلّ شانہ کی قسم دو عنوان ''اللہ'' اور ''ربّ'' کے ساتھ بیان ہوئی۔

''وَ اللّٰہِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ؛ خدا کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے''۔[۱]

''وَ رَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ؛ میرے پروردگار کی قسم! بیشک یہ برحق ہے۔''[۲]

۲۔قرآن، شریعتِ حقہ اور صاحبِ شریعت کی قسم

''وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ؛ قرآن حکیم کی قسم''۔[۳]

''وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ؛ روشن کتاب کی قسم'' (اس آیت میں کتاب سے مراد شریعتِ حقہ ہے)۔[۴]

''لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ؛ آپ کی جان کی قسم! یہ لوگ گمراہی کے نشہ میں اندھے ہورہے ہیں''۔ (اس لحاظ سے کہ یہ گفتارِ الٰہی ہو اور خطاب پیغمبر اکرمؐ سے ہو)۔[۵]

۳۔فرشتوں کی قسم

قرآن کریم میں ایسے فرشتوں کی قسم کا ذکر ہے جو نظامِ کائنات چلانے اور انسانوں کی خدمت کرنے پر مامور ہیں۔

''وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا؛ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا؛ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا؛ باقاعدہ طور پر صفیں باندھنے والوں کی قسم، پھر مکمل طریقہ سے تنبیہ

---

[۱] سورہ انعام/آیت ۲۳

[۲] سورہ یونس/آیت ۵۳

[۳] سورہ یٰس/آیت ۲

[۴] سورہ دخان/آیت ۲

[۵] سورہ حجر/آیت ۷۲

کرنے والوں کی قسم، پھر ذکر خدا کی تلاوت کرنے والوں کی قسم"۔ ۱

"فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا: پھر ایک امر کی تقسیم کرنے والوں کی قسم"۔ ۲

۴۔انسان اور اس کی اندرونی صفات کی قسم

"وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا؛ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا؛ اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا ہے، پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت کی ہے"۔ ۳

۵۔قیامت کی قسم

قیامت کی قسم (جو مادی زندگی کا اختتام۔ حقیقی زندگی اور ابدی سعادت کا آغاز ہے)۔

"وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ؛ اور اس دن کی قسم جس کا وعدہ دیا گیا ہے"۔ ۴

۶۔مظاہر کائنات کی قسم

آسمان وزمین، سورج، چاند اور ستارے، شب وروز کی تبدیلی، بادل، ہوا، دریا، سمندر اور ہر وہ چیز جو مخفی ہے یا ظاہر۔ اس کی قسم۔

"وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ؛ آسمان اور رات کو آنے والے (ستارے) کی قسم"۔ ۵

"وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا؛ اور زمین کی قسم اور جس نے اسے بچھایا ہے"۔ ۶

"وَالْفَجْرِ؛ وَلَيَالٍ عَشْرٍ؛ وَّ الشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ؛ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ؛ قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جفت وطاق کی، اور رات کی جب وہ جانے لگے"۔ ۷

"وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ؛ اور بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم"۔ ۸

---

۱) سورۂ صافات / آیت ۳۔۱

۲) سورۂ ذاریات / آیت ۴

۳) سورۂ شمس / آیت ۷ اور ۸

۴) سورۂ بروج / آیت ۲

۵) سورۂ الطارق / آیت ۱

۶) سورۂ والشمس / آیت ۶

۷) سورۂ فجر / آیت ۴۔۱

۸) سورۂ طور / آیت ۶

۷۔ مقدس مقامات کی قسم

کوہِ طور، بیت المعمور، بیت المقدس اور بلدِ امین کی قسمیں بیان ہوئی ہیں۔

''وَالطُّوْرِ ؛طور کی قسم۔'' [۱]

بنابرایں کہ اس آیت میں وادی سینا میں واقع کوہِ طور مراد ہو کہ جہاں پر حضرت موسیٰ ؑ خداوند متعال سے مناجات کرنے کیلئے جایا کرتے تھے۔

''وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ؛اور بیت معمور کی قسم''۔ [۲]

''وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ؛وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ؛وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ؛قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طورِ سینین کی اور اس امن والے شہر کی''۔ [۳]

انجیر اور زیتون کے درختوں کی نشوونما کی جگہ جبلِ قدس (یعنی بیت المقدس) ہے۔

سوالات

۱۔ قسم اور تاکید میں کیا فرق ہے؟

۲۔ قسم کے عناصر کون سے ہیں؟

۳۔ قرآن کریم میں کتنی طرح کی قسمیں ذکر ہوئی ہیں، ان کے نام بیان کریں؟

۴۔ صریح قسم کی مثال کے ساتھ وضاحت کریں؟

۵۔ آیت ''فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ''میں نوعِ قسم بیان کریں اور بتائیں کہ اس آیت میں حرفِ ''لا'' کس لیے ذکر ہوا ہے؟

۶۔ آیت ''وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ''میں نوعِ قَسم، مقسَم بہ اور جوابِ قَسم معیّن کریں؟

۷۔ قرآن کریم میں جن چیزوں کی قسم بیان ہوئی ہے اُن میں سے کوئی چار مثال کے ساتھ بیان کریں؟

---

[۱] سورۂ طور / آیت ۱

[۲] سورۂ طور / آیت ۴

[۳] سورۂ والتین / آیت ۳-۱

قرآنی مثالیں

تمثیل یا ضرب المثل اس خیال یا تصور کی نقشہ کشی ہے جو انسان کے ذہن میں مجسم شکل اختیار کرلیتا ہے۔ضرب المثل سامعین و ناظرین پر اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس معرکہ میں موجود پاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام واقعات کو بہت قریب سے مشاہدہ کر رہا ہے۔کبھی یہ نقشہ کشی اس قدر مؤثر ہوتی ہے کہ سننے یا دیکھنے والا خود کو اس واقعہ کا ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔

قرآن کریم نے بھی اپنے اعلیٰ مطالب تمثیل،تشبیہ اور استعارہ کی شکل میں بیان کئے ہیں۔تمثیل یا ضرب المثل قرآن کریم کی ایک اہم خصوصیت ہے جس نے اپنے سامعین اور مخاطبین کو بہت متاثر کیا ہے اور یہ انداز دعوت وتبلیغ کا مؤثر ترین ذریعہ شمار ہوتا ہے۔تمام قرآنی مثالوں میں انتہائی دیدہ زیب پینٹنگز کی مانند مورد نظر اور پسندیدہ حالات کی ماہرانہ نقشہ کشی کی ہے تاکہ مخاطب انسانی زندگی کے اچھے اور بُرے مناظر کا مشاہدہ کر کے صحیح فیصلہ کر سکے۔

تمثیل ایک ایسی فرضی صورت ہے جو لوگوں کی اندرونی حالت کی کچھ یوں حکایت کرتی ہے کہ انسان اسے ایک محسوس واقعیت سمجھتا ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ:تمثیل یعنی کسی نامحسوس امر کو محسوس چیز سے یوں تشبیہ دینا کہ اس کے ذریعہ یہ پتہ چلے کہ متکلم کے مورد نظر مطلب قابل فہم اور بذریعہ حواس قابل درک ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَتِلْکَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ؛اور ہم ان مثالوں کو انسانوں کیلئے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ شاید وہ کچھ غور وفکر کرسکیں''۔ ۱

تمثیل کی خصوصیات

ابن اثیر (متوفی ۶۳۷ھ) اپنی کتاب ''المثل السائر؛جلد ۲،صفحہ ۱۲۳'' میں لکھتے ہیں کہ:مثال میں تین خصوصیات پائی جاتی ہیں:۱۔مبالغہ ۲۔بیان ۳۔ایجاز

۱) سورۂ حشر/آیت ۲۱

۱۔ مبالغہ

معنیٰ ومفہوم کی رسائی کیلئے تاکید کرنا اور مقصود صحیح معنوں میں ادا کرنا ''مبالغہ'' کہلاتا ہے۔ ممکن ہے مثال کے بغیر سادہ کلام اپنا مقصد پورا نہ کرے اور اپنے معنیٰ ومفہوم کو واضح اور مکمل طور پر ادا نہ کر سکے۔ لیکن ایسا کلام جو تشبیہ اور مثال سے مزین ہو وہ اپنے ہدف کو بہتر انداز میں بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ کافروں کے فضول اعمال کے بارے میں ذکر ہوا ہے:

''مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ؛ جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی ہے جسے آندھی وطوفان کے دن کی تند ہوا اڑا لے جائے کہ وہ اپنے حاصل کیے ہوئے پر بھی کوئی اختیار نہ رکھیں گے اور یہی بہت دور تک پھیلی ہوئی گمراہی ہے''۔ [۱]

کافروں کے اعمال کو خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس طرح کافروں کے اعمال کی ناپائیداری برملا ہو رہی ہے جبکہ عام سادہ گفتگو میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر کلام الٰہی کے ذیل میں یہ تشبیہ نہ ہوتی تو ہدف پوری طرح واضح نہ ہو پاتا یعنی اگر خداوند متعال صرف یہی فرماتا کہ: ''کافروں یا ریاکاروں کے اعمال تباہ ہیں'' تو اس تباہی کا بخوبی پتہ نہ چلتا۔ یہیں سے مثال کی دوسری خصوصیت یعنی بیان بھی آشکار ہو جاتی ہے۔

۲۔ بیان

تمثیل کی دوسری خصوصیت بیان ہے۔ مثال کے ذریعہ مطلب بہتر انداز میں آشکار ہوتا ہے۔ لیکن اگر کلام مثال کے بغیر ہو تو ہرگز ایسا نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ ایجاز

ایسا مختصر کلام جس کا روح مطلب بہت اعلیٰ اور مضمون بہت وسیع ہو۔ مثال سے مزین کلام میں ایجاز کی خصوصیت مکمل طور پر پائی جاتی ہے۔ کیونکہ مثال پر مشتمل مختصر ترین کلام بہترین اور رساترین ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں تمثیل کی اقسام

تمثیل ایسی ضرب المثل ہے جس میں افراد کی باطنی صفات یا اندرونی حالات یا اچھے بُرے کی نقشہ کشی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں تصورات سے بخوبی استفادہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ایک ایسی حقیقت کی حکایت کرتی ہے جس سے انسانی کردار کی بنیاد تشکیل پاتی ہے۔ مثال کے ذریعے انسانی افکار ونظریات کی خوبیاں اور خامیاں واضح ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس سے معجزے کی حد تک استفادہ کیا ہے۔

---

[۱] سورۂ ابراہیم / آیت ۱۸

ذیل میں قرآن کریم میں استعمال ہونے والی تمثیل کی اقسام اور ہر ایک کی مثال بیان کی گئی ہے:

۱۔ذہنی مفاہیم کا محسوس انداز میں بیان کرنا

کفار جو بارگاہِ الٰہی سے دور چکے ہیں اور آخرت میں بھی سعادت سے محروم ہیں قرآن نے ان کی دو طرح سے نقشہ کشی کی ہے۔

اولاً: کفار کی مثال ان لوگوں کی مانند ہے جو آسمانی دروازوں کے پیچھے غمزدہ حالت میں کھڑے ہیں جبکہ دروازے ان کیلئے بند ہیں۔

ثانیاً: ناممکن کام کے انجام دینے کی کوشش کرنا۔ جیسے موٹی اور مضبوط رسّی کو سوئی کے باریک سوراخ سے گذارنے کی کوشش۔

''اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡہَا لَا تُفَتَّحُ لَہُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ؛ بیشک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور غرور سے کام لیا ان کیلئے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ ہی وہ جنت میں داخل ہوسکیں گے، جب تک اونٹ سوئی کے سوراخ کے اندر داخل نہ ہو جائے۔'' ۱

۲۔نفسانی اور معنوی حالات کو مجسم کرنا

ایسے افراد جن کیلئے شناخت اور معرفت کے اسباب فراہم ہوں لیکن وہ ان سے منہ پھیر لیں، تو قرآن کریم میں ان کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جن کیلئے سرے ہی سے ہدایت کا کوئی سبب اور وسیلہ فراہم نہ کیا گیا ہو۔ جس کے نتیجہ میں وہ بہت پریشان حال زندگی بسر کرتے ہیں۔

''وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ الَّذِیۡۤ اٰتَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانۡسَلَخَ مِنۡہَا فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ فَکَانَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ؛ وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِہَا وَ لٰکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الۡکَلۡبِ اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَیۡہِ یَلۡہَثۡ اَوۡ تَتۡرُکۡہُ یَلۡہَثۡ؛ اور انہیں اس شخص کی خبر سنائیں جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں پھر وہ ان سے بالکل الگ ہوگیا اور شیطان نے اس کا پیچھا پکڑ لیا تو وہ گمراہوں میں ہوگیا اور اگر ہم چاہتے تو اسے انہی آیتوں کے سبب بلند کر دیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے خواہشات کی پیروی اختیار کر لی تو اب اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اگر اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہتا ہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہتا ہے''۔ ۲

۳۔مختلف انسانی نمونوں کا بیان

قرآن کریم میں مختلف خصوصیات کے حامل افراد کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ضدی اور ہٹ دھرم افراد جو بے بنیاد اور فضول جذبہ کے ساتھ بالکل اندھوں کی طرح حق کا مقابلہ کرتے ہیں ان کی مثال اس انداز میں بیان کی گئی ہے۔

---

۱) سورۂ اعراف / آیت ۴۰

۲) سورۂ اعراف / آیت ۱۷۶-۱۷۵

''وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ؛ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ؛ ہم اگر آسمان میں ان کیلئے کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ لوگ دن دیہاڑے اسی دروازے سے چڑھ جائیں تو بھی کہیں گے کہ ہماری آنکھوں کو مدہوش کر دیا گیا ہے اور ہم پر جادو کر دیا گیا ہے''۔[1]

۴۔ مختلف واقعات کی نقشہ کشی

قرآن کریم میں عقلی مفاہیم، مختلف حالات و شخصیات کے علاوہ جنگوں اور واقعات کی کچھ اس طرح نقشہ کشی کی گئی ہے کہ ان کا ایک ایک کردار نکھر کر مجسم طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ احزاب ہے۔ جس میں مسلمانوں کی کامیابی، مشرکین کی واضح شکست، تمام افراد اور گروہوں کے ظاہری و باطنی حالات انتہائی واضح طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں پیش آنے والے تمام واقعات و حوادث قابل مشاہدہ ہیں کہ جنہیں نزدیک سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

''ایمان والو! اس وقت اللہ کی نعمت یاد کرو جب کفر کے لشکر تمہارے سامنے آ گئے اور ہم نے ان کے خلاف تمہاری مدد کیلئے تیز ہوا اور ایسے لشکر بھیج دیے جن کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔ اس وقت جب کفار تمہارے اوپر کی طرف سے اور نیچے کی سمت سے آ گئے اور دہشت سے نگاہیں خیرہ کرنے لگے اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے خیالات میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت مومنین کا باقاعدہ امتحان لیا گیا اور انہیں خوب جھنجھوڑا گیا اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور رسول نے ہم سے صرف دھوکہ دینے والا وعدہ کیا ہے اور جب ان کے ایک گروہ نے کہہ دیا کہ مدینہ والو اب یہاں ٹھکانا نہیں ہے لہذا واپس بھاگ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا کہ ہمارے گھر خالی پڑے ہیں حالانکہ وہ گھر خالی نہیں تھے بلکہ یہ لوگ صرف بھاگنے کا ارادہ کر رہے تھے''۔[2]

۵۔ حقیقی اوصاف کی مصوری

قرآن کریم میں تمثیل کے نمونوں میں سے ایک نمونہ دنیا میں موجود اشیاء کے حقیقی اوصاف کی مصوری ہے۔ جس میں ان اشیاء کی اچھائی و برائی یا ان کے مثبت و منفی اثرات بخوبی عیاں کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں دنیاوی زندگی اور اس کی ناپائیداری کے متعلق بیان ہوا ہے:

''وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؛ اور انہیں دنیاوی زندگی کی مثال اس پانی کی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا تو زمین کی روئیدگی اس سے مل جل گئی

---

[1] سورۂ حجر/آیت ۱۵۔۱۴

[2] سورۂ احزاب/آیت ۱۳۔۹

پھر آخر میں وہ ریزہ ریزہ ہوگئی جسے ہوائیں اُڑا دیتی ہیں'' [۱]

دنیوی زندگی کو روح افزا بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو زمین کی زندگی اور اس کے سرسبز و شاداب ہونے کا سبب بنتی ہے جو بالآخر خشک ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ بارش کے برسنے، سبزے کے اُگنے اور زمین کے سرسبز و شاداب ہونے کا منظر کتنا دلنشین اور لذت بخش ہے۔ لیکن سرانجام وہ سبزہ، گھاس اور بیل بوٹے سوکھ کر ضائع اور نابود ہو جاتے ہیں اور تند و تیز ہوائیں انہیں فضا میں بکھیر دیتی ہیں۔

۶۔ ضرب المثل بن جانیوالی داستانوں کا منظر

قرآنی مثالوں کا ایک نمونہ ان داستانوں کی منظر کشی ہے جو معاشرے میں ضرب المثل بن گئی ہیں۔ جیسے یہ داستان:

''ہم نے ان کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ صبح کو پھل توڑ لیں گے اور انشاء اللہ نہیں کہیں گے (کسی استثناء کے قائل نہ ہوئے) تو خدا کی طرف سے راتوں رات ایک بلاء نے چکر لگایا جب یہ سب سو رہے تھے اور سارا باغ جل کر کالی رات جیسا ہو گیا۔ پھر صبح کو ایک نے دوسرے کو آواز دی کہ پھل توڑنا ہے تو اپنے اپنے کھیت کی طرف چلو۔ پھر سب گئے اس عالم میں کہ آپس میں رازدارانہ باتیں کر رہے تھے کہ خبردار آج باغ میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے اور روک تھام کا بندوبست کر کے صبح سویرے پہنچ گئے۔ اب جو باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو بہک گئے۔ بلکہ بالکل محروم ہو گئے تو ان کے منصف مزاج نے کہا: میں نہ کہتا تھا کہ تم لوگ تسبیحِ پروردگار کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے: کہ ہمارا رب پاک و بے نیاز ہے اور ہم واقعاً ظالم تھے۔ پھر ایک نے دوسرے کو ملامت کرنا شروع کر دی۔ کہنے لگے کہ افسوس! ہم بالکل سرکش تھے۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس سے بہتر دیدے کہ ہم اس کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ اسی طرح عذاب نازل ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے بڑا ہے اگر انہیں علم ہو''۔ [۲]

ان آیات میں مختلف حالات کی نقشہ کشی ہوئی ہے۔

۱) بے جا خود اعتمادی اور خداوند متعال سے بے توجہی۔

۲) خودغرض اور دوسروں کو محروم کرنا۔

۳) خود پسندی اور اپنی طاقت کا گھمنڈ۔

۴) افسردگی اور پریشانی کی حالت میں خود کو بے چارہ سمجھنا۔

۵) پشیمانی کے ساتھ خدا کی طرف پلٹنا اور مقدرات الٰہی پہ سر تسلیم خم کرنا۔

---

۱) سورۂ کہف رآیت ۴۵

۲) سورۂ قلم رآیت ۳۳۔۱۷

قرآن کریم میں ضرب المثل کا استعمال

قرآن کریم میں تین طرح کی ضرب المثل پائی جاتی ہیں:

۱۔ ایسی ضرب المثل کہ جس میں تخیلاتی قوت کے ذریعہ افراد کی اندرونی حالت یا اچھے بُرے کی تصویر کشی ہوئی ہے۔ قرآنی علوم کی اصطلاح میں یہ "تمثیل" ہے جس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

۲۔ ایسی ضرب المثل کہ جس میں آئندہ نسلوں کیلئے گذشتہ اقوام کی سرگذشت اور عروج وزوال کا بیان ہے۔ ضرب المثل کی یہ قسم حقیقت پر مبنی ہے نہ کہ تخیل پر۔ بطور مثال قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ... وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ...

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ؛ خدا نے کفر اختیار کرنے والوں کیلئے زوجۂ نوح اور زوجۂ لوط کی مثال بیان کی ہے اور خدا نے ایمان والوں کیلئے فرعون کی زوجہ کی مثال بیان کی ہے۔۔۔اور مریم بنت عمران کی مثال کہ جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی"[۱]

خداوند متعال نے ان آیات میں دو بُری اور دو نیک وصالح عورتوں کا ذکر کیا ہے۔ تا کہ ان لوگوں کیلئے یاددہانی اور تنبیہ کا سبب بنے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان ماحول کا تابع ہے اور اس کے خیالات ونظریات اور رفتار وکردار معاشرے میں رائج ماحول کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کا اپنا مستحکم ارادہ ہے جو اسے بناتا ہے۔ (کیونکہ ضرب المثل کی یہ قسم قرآنی قصوں سے مربوط ہے لہذا اسے اپنے مقام پر بیان کیا گیا ہے)۔

۳۔ ایسے مختصر جملات (ضرب المثل) کا بیان کہ جن میں کوئی اہم سرگذشت پائی جاتی ہو۔ ایسی ضرب الامثال ہر زبان وسرزمین اور قوم وملت میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے عربوں میں رائج ضرب الامثال استعمال نہیں کیں بلکہ اس کے برعکس عرب معاشرے میں قرآنی ضرب الامثال نے خوب رواج پایا۔

قرآن کریم سے ماخوذ ضرب الامثال دو طرح کی ہیں:

۱۔ صریح مثالیں   ۲۔ ضمنی مثالیں

ذیل میں دونوں قسموں کے نمونے بیان کیے گئے ہیں:

۱۔"وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ؛ حالانکہ بری چالیں چالباز ہی کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔"[۲]

"جو کسی کیلئے گڑھا کھودتا ہے، خود اس میں گرتا ہے"۔

۲۔" اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا؛ اگر تم نیک عمل کرو گے تو اپنے لئے اور برا کرو گے تو اپنے لئے

---

[۱] سورۂ تحریم/آیت ۱۲۔۱۰

[۲] سورۂ فاطر/آیت ۴۳

کروگے" [۱] "اپنا کیا اپنے آگے" یا "جو بوؤ گے، سو کاٹو گے"۔

۳۔"وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ؛اور انسان کیلئے صرف اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی"۔ [۲] "آخر کار ڈھونڈنے والا پالیتا ہے"۔

۴۔"وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؛اور کوئی نفس دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا"۔ [۳] "اپنا بوجھ، اپنا دوش"۔

۵۔"لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ؛تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔ [۴] "اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ"۔

۶۔"اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ...وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ ؛خبیث چیزیں، خبیث لوگوں کیلئے ہیں...اور پاکیزہ باتیں، پاکیزہ لوگوں کیلئے ہیں" [۵] "کبوتر با کبوتر، باز با باز، ہم جنس کند، با ہم جنس پرواز"۔

۷۔"فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ؛ہاں زحمت کے ساتھ آسانی بھی ہے، بیشک تکلیف کے ساتھ سہولت بھی ہے"۔ [۶] "ہر دکھ کے بعد سکھ" یا "رنج، بن گنج نہیں"۔

۸۔"وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ؛اور ہر برائی کا بدلہ اس کے جیسا ہوتا ہے" [۷] "جیسا کروگے، ویسا بھروگے"۔

۹۔"وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ؛اور یہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان اوسط درجہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں"۔ [۸] "میانہ روی بہترین طریقہ کار ہے"۔"وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْھَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ؛اور خبردار نہ اپنے ہاتھوں کو گردنوں سے بندھا ہوا قرار دو اور نہ بالکل پھیلا دو کہ آخر میں قابلِ ملامت اور خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ"۔ [۹] "جاہل افراط کرتا ہے یا تفریط"

۱۰۔"وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؛اور اس موقع کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے التجا کی پروردگار مجھے یہ دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوا کیا تمہارا ایمان نہیں

---

۱) سورۂ بنی اسرائیل/آیت ۷

۲) سورۂ نجم/آیت ۳۹

۳) سورۂ انعام/آیت ۱۶۴

۴) سورۂ کافرون/آیت ۶

۵) سورۂ نور/آیت ۲۶

۶) سورۂ انشراح/آیت ۶۔۵

۷) سورۂ شوریٰ/آیت ۴۰

۸) سورۂ فرقان/آیت ۶۷

۹) سورۂ بنی اسرائیل/آیت ۲۹

ہے۔عرض کی ایمان تو ہے لیکن اطمینان چاہتا ہوں''۔ [1] ''سننا، دیکھنے کے برابر کہاں''۔

۱۱۔''وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ؛اور جو بھی راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا'' [2] ''حرکت میں برکت ہے''''سفر، وسیلہ ظفر ہے''۔

سوالات

۱۔''مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ'' سورۂ ابراہیم/آیت ۱۸ کے ذیل میں تمثیل کی تینوں خصوصیات بیان کریں؟

۲۔قرآن کریم میں تمثیل تخیلات کی عکاسی کرتی ہے یا حقیقت کی؟ وضاحت کریں؟

۳۔قرآن کریم میں کفار کی کتنی طرح نقشہ کشی کی گئی ہے؟

۴۔آیہ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ'' سورۂ کہف/آیت ۴۵ میں اس دنیوی زندگی کی توصیف کس طرح کی گئی ہے؟

۵۔کوئی سی پانچ رائج قرآنی ضرب المثل بیان کریں؟

---

[1] سورۂ بقرہ/آیت ۲۶۰

[2] سورۂ نساء/آیت ۱۰۰

انیسواں سبق

اعجازِ قرآن

اعجاز کی اصل ''عجز'' ہے جو عاجز (کمزور اور مغلوب) کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ عاجز کرنا بھی دو طرح کا ہے۔ پہلا: کسی کی توانائی اس سے زبردستی سلب کر لی جائے جس سے وہ عاجز اور مجبور ہو جائے۔ بطور مثال اگر کوئی شخص مال یا مقام و منصب کے اعتبار سے بڑی قدرت رکھتا ہو اور کوئی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس سے یہ مال و مقام چھین لے اور اسے ذلیل و رسوا کر دے۔ اس عمل کو بھی عاجز کرنا کہتے ہیں۔

دوسرا: کوئی شخص دوسروں کے خلاف کوئی منفی قدم اٹھائے بغیر ایسا کام انجام دے کہ دوسرے لوگ اسے انجام دینے سے عاجز ہوں۔

اعجاز انبیاء اسی دوسری قسم سے ہے یعنی وہ کام جو اُن کے ہاتھوں انجام پاتا ہے کسی بشر کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کام اثر انداز ہونے والے جانے پہچانے عوامل کے دائرے سے باہر ہے۔ جن کی شناخت طبیعی اور مروجہ اصولوں کی بنا پر انسان کیلئے ناممکن ہے۔ یعنی ایسا کام انجام پایا ہے کہ اس دنیا کے افراد اسے انجام دینے سے عاجز ہیں، اسی لئے معجزے کو ''خارق العادۃ'' کہتے ہیں۔ یعنی ایسا کام جو جانے پہچانے اور معروف طبیعی عوامل سے ہٹ کر انجام پاتا ہے اور اس جہان میں موجود نظام اس کے انجام دینے سے قاصر ہے۔

اعجاز کی ضرورت

بلاشک انبیاء کی دعوت حق کی عین وضاحت ہے انسان کی پاکیزہ فطرت کے عین موافق اور عقل سلیم سے ہم آہنگ ہیں۔ انبیاءؑ جو بھی کہتے ہیں انسانی فطرت اور عقل بشری اسے فوراً آزادانہ قبول کر لیتی ہے۔

انبیاءؑ کی طرف سے آسمانی پیغامات، روشن ترین حقائق پیش کئے جاتے ہیں۔ ''وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ؛ ہم نے قرآن کو عین حق کے ساتھ نازل کیا ہے (یعنی ایسی حقیقت جو واضح و آشکار اور انکار ناپذیر ہے) اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے''۔[۱]

لہٰذا قرآن کریم میں متعدد بار اس بات کی صراحت ہوئی ہے کہ غور و فکر کرنے والے آگاہ افراد فوراً دعوت حق قبول کرتے ہیں

---

[۱] سورہ بنی اسرائیل/ آیت ۱۰۵

اور حق وحقیقت کی آواز پر لبیک کہتے ہیں:

''وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ؛ صاحبان علم کو معلوم ہو جائے کہ شریعت الٰہی برحق ہے اس طرح وہ ایمان لے آئیں اور پھر ان کے دل اس کی بارگاہ میں عاجزی کا اظہار کریں۔ [1]

حق قبول نہ کرنے والے اور اس کا مقابلہ کرنے والے فقط وہ لوگ ہیں جو اسے اپنے ذاتی مفادات اور وہمی مصلحتوں کے خلاف پاتے ہیں۔ اگرچہ وہ دل میں حق وحقیقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

''وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا؛ انہوں نے ظلم وغرور کی بناء پر انکار کر دیا تھا۔ ورنہ ان کے دل کو مکمل یقین تھا''۔ [2]

لہذا قرآن مجید کی منطق کے مطابق حق ہمیشہ واضح ہے لیکن باطل خودنما ہے۔ حق قبول کرنے کے لئے فطرت اور عقل وخرد کے علاوہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ حق وحقیقت کے متلاشیوں کے لئے خود حق کا بیان کرنا ہی واضح ترین دلیل ہے۔ کیونکہ حق خود بخود آشکار ہے جسے پاک فطرت لوگ فوری قبول کر لیتے ہیں۔

قرآنی وضاحت اور انبیاء کی سیرت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء میں سے کسی ایک نے بھی اپنی دعوت کا آغاز معجزہ سے نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی دعوت بالکل حق ہے جسے انسانی عقل وفطرت آسانی سے قبول کرتی ہے لیکن منکرین سے سامنا ہونے پر اور ان کے معجزہ طلب کرنے پر (یا طلب کے بغیر صرف ان کے شبہات کو برطرف کرنے کے لئے) انبیاءؑ نے معجزے پیش کیے۔ پس معجزے کا استعمال بنیادی طور پر دعوت حق کے اظہار اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے نہ تھا بلکہ دوسرے مرحلہ میں جب رکاوٹوں کا سامنا ہوتا تو ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ لہذا معجزہ ایک دفاعی ذریعہ ہے محض تبلیغی وسیلہ نہیں ہے۔ [3]

معجزۂ جاوید

مختلف زمانوں میں انبیاء الٰہی اپنے زمانے کے انسانوں کی سطح فکر وعقل اور وجودی کمالات کے مطابق طرح طرح کے معجزے پیش کیا کرتے تھے۔ لوگوں کے علم ودانش میں جتنا اضافہ ہوتا اور ان کی ثقافت وتمدن کی سطح جتنی بلند ہوتی انبیاء الٰہیؑ کے معجزے بھی ترقی کر کے اتنے ہی زیادہ دقیق اور لطیف ہوتے چلے جاتے تھے۔ انبیاء الٰہیؑ کے معجزوں میں سب سے آخری پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کا معجزہ ''قرآن کریم'' ہے۔ جو دوسرے تمام انبیاءؑ کے معجزوں کی نسبت سب سے زیادہ دقیق، لطیف اور ظریف ہے۔

---

[1] سورہ حج/آیت ۵۴

[2] سورہ نمل/آیت ۱۴

[3] علوم قرآنی، ص ۳۵۰ـ۳۴۵

بنابرایں قرآن ایسا معجزہ ہے جو بہترین اسلوب، واضح ترین بیان اور محکم ترین مفہوم کے ساتھ اس زمانہ کے عربوں پر ظاہر ہوا۔ چونکہ اس زمانہ میں عربوں کی مہارت صرف زبان و بیان میں منحصر تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس بات کی اچھی طرح تشخیص دی کہ ایسا کلام کسی بشر کا نہیں ہوسکتا اسی بات نے انہیں اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیا ہے۔ انبیاء الٰہیؑ کے ان معجزات کا جواب دینے پر اس زمانہ کے ماہرترین افراد بھی قدرت نہ رکھتے تھے۔ انبیاءؑ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ درحقیقت جو کچھ بھی وہ معجزے کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ بشر کی طاقت اور مہارت سے باہر ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی دکھاوا نہیں ہے۔

ولید بن مغیرہ مخزومی اپنے زمانے میں عربوں کے درمیان سخنور شاعر اور معزز و مشہور شخص تھا۔ وہ قرآن کریم کے بارے میں کہتے ہیں:

خدا کی قسم! جو کچھ ابی کبشہ کا بیٹا کہتا ہے وہ نہ شعر ہے نہ جادو اور نہ ہی وہ احمقانہ اور بیہودہ باتیں ہیں بلکہ بلاشبہ وہ کلامِ خدا ہے۔ (مشرکین پیغمبر اکرم ﷺ کو ابو کبشہ سے نسبت دیتے تھے۔ جو قبیلہ خزاعہ سے تھا اور عقیدہ کی بنا پر قریش کی مخالفت کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ کے ننھیالی بزرگ تھے اسی لیے آپ ﷺ کو اس سے منسوب کرتے تھے)۔

وہ ایسے موقع پر پیغمبر اکرمؐ کے پاس سے گذرے جب آپ نماز میں سورہ مومن کی تلاوت فرما رہے تھے۔

ولید بن مغیرہ نے اس سورہ کی چند آیتیں سننے کے بعد کہا:

خدا کی قسم! میں نے محمد ﷺ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کی گفتار اور نہ جنوں کے کلام کی مانند ہے۔ خدا کی قسم! اسکی گفتار میں مخصوص مٹھاس اور کلام میں ایک خاص قسم کی خوبصورتی ہے ایک تناور درخت کی مانند جو اوپر سے پھل دار اور نیچے سے اس کی جڑیں مضبوط اور پائیدار ہوں۔ یہ کلام ہر چیز سے اعلیٰ ہے اور کوئی بھی چیز اس سے بلند نہیں ہوسکتی ہے۔ [1]

بیان، نظم اور مفہوم کے لحاظ سے قرآن کی یہ عظمت اور مقام ابھی تک اپنی جگہ پر برقرار ہے اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا۔ کیونکہ فصاحت و بلاغت، واضح ترین بیان، بہترین اسلوب، احکام و معارف سے متعلق محکم ترین مفہوم اور دقیق و جدید جیسی دیگر کئی اہم خصوصیات اس میں اپنے عروج پر ہیں۔ انسان چاہے جتنی ترقی کرلے اور اس تک پہنچنے کی جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرلے پھر بھی قرآن کریم کے تمام حقائق درک نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم کی یہ کیفیت ابدی اور پائیدار ہے جو دین اسلام کی جاودانہ شریعت ہونے کے عنوان سے بطور سند قیامت تک باقی رہے گی۔ اسی لیے قرآن کریم کو ''معجزہ جاوید'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تحدی قرآن

''تحدی'' کے معنی ''مقابلے کیلئے للکارنا'' ہے۔ قرآن مجید نے بے یقین اور شک کرنے والے افراد کو بار بار مقابلے کی

۱) تفسیر طبری؛ جلد ۲۹ ص ۹۸

دعوت دی ہے اور کہا ہے: اگر تمہیں قرآن کے کلامِ خدا ہونے پر یقین نہیں ہے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ یہ قرآن بشری تصنیف ہے تو یقیناً اس کا پرکھنا آسان ہے۔ اپنے سخنوروں اور ادیبوں کو تیار کرو تا کہ اس سلسلہ میں اپنی طاقت آزمائیں اور قرآن کی طرح خوبصورت، خوشنما، محکم، پائیدار اور حکیمانہ کلام بنالائیں۔ لیکن تم ایسا کام ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قرآن بشر کا کلام نہیں ہے۔

تحدی سے مراد، کلام اللہ کی مانند اور اس کے برابر کلام نہیں ہے کہ جو اسلوبِ بیان اور طرزِ تعبیر کے لحاظ سے بالکل قرآن جیسا ہو۔ کیونکہ ایسا تو صرف قرآن کی تقلید اور نقل کیے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہے۔ بلکہ تحدی سے مراد ایسا کلام ہے جو قرآن کی مانند معنوی لحاظ سے عظیم مرتبہ اور فصاحت و بلاغت کے سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو۔

تحدی کے مراحل

قرآن مجید نے اپنی مثل لانے کا کئی مرتبہ چیلنج کیا ہے اس کا ذکر درج ذیل چند مرحلوں میں کیا گیا ہے:

۱۔ پہلے مرحلے میں کلی طور پر یہ کہا کہ قرآن کی مانند کوئی کلام لے کر آؤ۔

''أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ؛فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ؛ کیا یہ کہتے ہیں نبی نے قرآن کو اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اگر یہ اپنی بات میں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کلام لے آئیں''۔ [۱]

۲۔ دوسرے مرحلہ میں قرآن کریم کی مانند دس (۱۰) سورتوں کے لانے کی دعوت ہے اگر چہ وہ سورے چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔

''قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ؛ کہہ دیجیے اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو تو تم بھی اس جیسی خود ساختہ دس سورتیں بنالاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو تم بلا سکتے ہو بلا لاؤ''۔ [۲]

۳۔ پھر قرآن کریم نے دعویٰ کرنے والوں کے اعتبار اور حیثیت کو مزید کم کرنے کیلئے تجویز پیش کی کہ قرآن کی مانند کوئی ایک سورت لے آؤ۔

''قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ؛ کہہ دیجیے اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنالاؤ اور اللہ کے سوا جسے تم بلا سکتے ہو بلا لاؤ'' [۳]

۴۔ آخر میں قرآن مجید نے ان کی پوری کمزوری اور مکمل ناتوانی کا بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ اعلان کر دیا ہے۔

---

[۱] سورۂ طور / آیت ۳۴۔۳۳

[۲] سورۂ ھود / آیت ۱۳

[۳] سورۂ یونس / آیت ۳۸

''وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ؛ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ: اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ، اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے مددگار ہیں سب کو بلالو اگر تم اپنے دعوے اور خیال میں سچے ہو اور اگر تم ایسا نہ کرسکے اور یقیناً نہ کرسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافرین کیلئے مہیا کیا گیا ہے''۔[۱]

اس آیت میں پتھروں کے ساتھ آدمیوں کا تذکرہ اس بات سے کنایہ ہے کہ جو لوگ عقل و خرد سے خالی اور بے شعور ہیں، وہ پتھر کی مانند ہیں اور آگ میں اُن پتھروں کے ساتھ جلیں گے۔

۵۔ پھر آخری مرحلے میں مخالف اور بے ایمان افراد کے ناگوار اور تلخ تجربے کے بعد قرآن مجید نے تمام بنی آدم سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جاودانی معجزے اور تحدی (چیلنج) کا اعلان کیا۔

''قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا؛ آپ کہہ دیں اگر (پوری انسانیت میں موجود) تمام انسان اور جن سب مل کر اس بات پر متفق ہوجائیں کہ اس قرآن کی مثل لے آئیں تو بھی نہیں لاسکتے چاہے ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہی کیوں نہ ہوجائیں''۔[۲]

آیاتِ تحدّی خصوصاً آخری دو آیتوں میں ایک اہم اور قابل توجہ نکتہ پایا جاتا ہے کہ جس سے معجزے کا راز زیادہ واضح اور مدلل ہوجاتا ہے۔ سورہ بقرہ کی چوبیسویں آیت کی عبارت میں ''وَلَنْ تَفْعَلُوْا'' کا لفظ بطور مطلق آئندہ کی خبر دیتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ تم سب ہرگز اور کبھی بھی قرآن کی مثل نہیں لاسکتے۔ سورہ بنی اسرائیل کی اٹھائیسویں آیت نے بھی سب دنیا والوں کو قرآن کی مثل لانے سے ناتواں سمجھا ہے۔ یہ ایک غیبی خبر ہے جس کا ''عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ'' کی زبان کے علاوہ کسی اور سے صادر ہونا ناممکن ہے۔ ہر ہنرمند اور طاقتور انسان جب بھی کسی کو چیلنج کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اپنے ہم عصر اور قریبی مدمقابل افراد کی قوت کا کچھ حد تک اندازہ لگا کر پھر اپنی طاقت کو برتر جان سکتا ہے۔ لیکن کوئی شخص ہرگز ہمیشہ کیلئے اور پوری دنیا کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر سمجھنے کی جرأت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ پوری دنیا کے آئندہ کے حالات سے باخبر نہیں ہوسکتا۔

لیکن قرآن مجید نے یہ جرأت و شہامت دکھائی ہے اور بڑی دلیری کے ساتھ طولِ تاریخ میں قرآن سے مقابلے میں ہمیشہ کیلئے بشر کی ناتوانی کا اعلان کیا ہے۔ یہی جرأت اور شجاعت اعجاز قرآن پر بہت بڑی دلیل ہے۔

---

۱) سورۂ بقرہ/آیت ۲۴۔۲۳

۲) سورہ بنی اسرائیل/آیت ۸۸

سوالات

۱۔ معجزے کی تعریف کریں؟ اسکی اقسام بیان کریں اور یہ بتائیں کہ اعجازِ قرآن کون سی قسم ہے؟

۲۔ قرآن کس لحاظ سے معجزہ ہے؟

۳۔ تحدّی کی تعریف کریں اور بتائیں کہ تحدی قرآن سے کیا مراد ہے؟

۴۔ تحدّی قرآن کے مراحل بیان کریں؟

۵۔ اعجازِ قرآن کی سب سے بڑی دلیل کیا ہے؟

بیسواں سبق

اعجازِ قرآن کے مختلف پہلو (۱)

علماء ودانشور حضرات نے اعجاز قرآن پر مفصل اور مختلف مطالب بیان کیے ہیں۔ البتہ اس موضوع پر ان کے درمیان اختلاف نظر بھی پایا جاتا ہے۔ متقدمین کی سوچ کا انداز کچھ اور تھا اور متاخرین کا کچھ اور مزید ان لوگوں نے اس موضوع میں نئے مطالب کا اضافہ بھی کیا ہے۔[1]

اعجاز قرآن کے تین اہم اور بنیادی پہلو درج ذیل ہیں:

۱۔ اعجاز بیانی ۲۔ اعجاز علمی ۳۔ اعجاز تشریعی

اس سبق میں اعجاز بیانی کے بارے میں اور اگلے سبق میں دیگر دو کے متعلق بیان ہوگا۔

۱۔ اعجازِ بیانی

اعجاز بیانی میں لفظی پہلو، عبارتیں، فصاحت وبلاغت کی ظرافتیں اور نکات مدنظر ہوتے ہیں۔ یہ ظرافتیں اور نکات معنیٰ اور مفہوم میں اصلی کردار ادا کرتے ہیں۔

بطور خلاصہ قرآن کے اعجاز بیانی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف) کلمات کا انتخاب

قرآن مجید کے جملوں اور عبارتوں میں الفاظ وکلمات کا انتخاب بہت دقیق ہے اگر ایک لفظ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا کوئی ایسا لفظ لے آنا چاہیں جس میں اصل کلمہ کی تمام خصوصیات بھی پائی جاتی ہوں تو ایسا لفظ کبھی بھی نہیں مل سکے گا۔ کیونکہ قرآنی الفاظ کا انتخاب اس طور انجام پایا ہے کہ:

۱۔ اس کے ہم ردیف کلمات کے حروف کی لے کا تناسب بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ ہر پچھلے لفظ کا آخری حرف اگلے لفظ کے

۱) قرآنی علوم، ص ۳۶۷۔۳۵۶

پہلے حرف کے ساتھ ہم آواز اور ہم آہنگ ہے۔

۲۔کلمات کی ایک دوسرے کے ساتھ معنوی تناسب کی بھی رعایت کی گئی ہے تا کہ مفہوم کے لحاظ سے بھی ایک منظم شکل وجود میں آجائے۔

۳۔علم ''معانی بیان'' میں مذکورہ شرائط کے لحاظ سے بھی الفاظ اور جملات کی فصاحت مدنظر رکھی گئی ہے۔

ہر کلمہ کی خصوصیات میں باریک بینی کے ساتھ ان تین باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔مجموعی طور پر ہر لفظ اپنی مخصوص جگہ پر اس طرح قرار دیا گیا ہے کہ ہرگز قابل تبدیل نہیں ہے۔

اس بارے میں مشہور ترین مثال آیتِ قصاص ہے:

''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ؛ اے صاحبان عقل! تمہارے لیے قصاص کے اجرائے قانون میں زندگی ہے کہ شاید تم (اپنی رفتار میں) متقی بن جاؤ''۔[1]

عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے عدالتی، اجتماعی اور شہری قوانین آسانی سے یاد کرنے کیلئے انہیں چھوٹے چھوٹے، ظریف و ادبی جملوں کے قالب میں ڈھالتے تھے۔انھوں نے قانون قصاص مرتب کرنے کیلئے بلند پایہ اور برجستہ ادیبوں سے مدد لی تا کہ مختصر ترین اور فصیح و بلیغ جملہ بنائیں۔جنھوں نے کئی نشستوں اور مشوروں کے بعد ''اَلْقَتْلُ أَنْفىٰ لِلْقَتْلِ؛ قتل، قتل میں رکاوٹ ہے'' کی عبارت بنا پائے۔لیکن ان سے آیتِ قصاص مدّمقابل اس جملے کے انتخاب میں چند نکات سے غافل رہے۔

پہلا نکتہ: کوئی چیز بھی اپنی نفی نہیں کرتی۔اس بنا پر ادبی لحاظ سے وہ بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ قتل کو قتل کی نفی قرار دیا۔ رکاوٹ بننے والے قتل کو مذکورہ عبارت میں بغیر کسی شرط کے بطور مطلق لائے ہیں۔جبکہ قتل قصاص کے عنوان سے انجام پائے، تب وہ قتل کی نفی کرتا ہے۔

دوسرا نکتہ: مذکورہ عبارت میں صیغہ ''أَفْعَلُ التَّفْضِيل'' استعمال کیا گیا ہے۔''مفضل علیہ'' مبہم ہے۔معلوم نہیں قتل کس چیز سے زیادہ روکتا ہے۔

تیسرا نکتہ: ادبی لحاظ سے آیت قصاص مثبت پہلو رکھتی ہے لیکن مذکورہ عبارت منفی پہلو کی حامل ہے۔جبکہ کلام میں مثبت عبارت منفی عبارت سے بہتر ہوتی ہے۔

چوتھا نکتہ: لفظ قصاص کے استعمال سے عدل و انصاف کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے۔جبکہ لفظ قتل کے استعمال میں نفرت و حقارت کا پہلو غالب ہے۔

پانچواں نکتہ: آیت میں لفظ ''حیات'' قصاص کے مقابلے میں بالکل ''فنِ طباق'' کے عین مطابق استعمال ہوا ہے۔جو دو ضدوں کے درمیان جمع پیدا کرنے کا فن ہے۔کیونکہ قصاص جو ایک قسم کا قتل شمار ہوتا ہے اور حیات کی ضدّ ہے جبکہ اس آیت میں

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۹

حیات کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

کلمات کے انتخاب میں یہ قرآنی دقتِ نظر دو بنیادی شرائط کی حامل ہے:

پہلی شرط: لغت کی تمام خصوصیات پر مکمل طور پر اس طرح احاطہ ہو کہ ہر لفظ کی خصوصیات سے پوری طرح واقف ہو۔

دوسری شرط: ہمیشہ حاضر دماغ ہونا، تا کہ الفاظ کے استعمال کے وقت تمام کلمات اس کے مدنظر رہیں اوران کے انتخاب میں کسی قسم کی پریشانی کا شکار نہ ہو۔

ب) بہترین اندازِ بیان

اگر چہ قرآن مجید کا انداز بیان عربوں کیلئے جاذبیت اور کشش کا باعث بنا لیکن عربوں میں رائج کسی بھی روش اور اسلوب سے شباہت و مماثلت نہیں رکھتا۔ قرآن مجید نے ایک نیا انداز بیان اور ایک نیا اسلوب پیش کیا ہے جو عربوں کیلئے بالکل نیا انداز تھا اور بعد میں عرب ایسا کلام پیش نہیں کر سکے۔ ان کی سیٹی گم ہوگئی۔

یہ خطابت کی حیرت انگیزی ہے کہ خطیب ایسا کلام پیش کرے جو سننے والوں کے رائج کلام کے اسلوب سے ہٹ کر ہونے کے باوجود ان کیلئے پسندیدہ اور قابل قبول ہو۔ اس سے بڑھ کر تعجب کا باعث یہ ہے کہ رائج کلام کی تمام اسلوبی خوبیوں سے استفادہ کیا جائے لیکن اس کلام کی خامیوں میں سے کسی قسم کا کوئی عیب نہ پایا جائے۔

اس زمانے میں عربوں کے درمیان کلام کی یہ مختلف انواع رائج تھیں: ۱۔شعر ۲۔نثر ۳۔سجع

ان تینوں رائج طریقوں میں خوبیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن قرآنی اسلوب، شعری قافیہ اور وزن کی تنگی، نثر کی پریشان گوئی اور سجع کی تکلف اور دشواری میں مبتلا ہوئے بغیر شعر کی جاذبیت و ظرافت، نثر کی مطلق آزادی اور سجع کی زیبائی سے مزیّن ہیں۔ یہی بات باریک بین عرب ادیبوں کیلئے حیرت کا باعث بنی ہے۔

ج) قرآن مجید کا موزوں کلام

دل وجان سے قرآن سنتے وقت پہلی حالت جو ذہنوں کو جلب کرتی ہے وہ اس کا بدیع اور پیارا صوتی نظام ہے۔ اس نظام میں الفاظ کی حرکات و سکنات ایسی شکل میں آراستہ ہیں کہ جب بھی اس کی دلنشین آواز کانوں تک پہنچتی ہے تو دل وجان میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا وہی باطنی آہنگ ہے جو احساسات کو ابھارتا ہے اور دلوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔
بطور مثال سورہ نجم دیکھئے:

''وَ النَّجمِ اِذَا هَوٰی؛ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَ مَا غَوٰی؛ وَ مَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰی؛ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوحٰی؛ عَلَّمَهُ شَدِیدُ الْقُوٰی؛ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی؛ وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی؛ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی؛ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی؛ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهِ مَا اَوْحٰی؛ مَا کَذَبَ

الْفُؤَادُ مَارَاٰى؛اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَايَرٰى؛وَلَقَدْرَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى؛عِنْدَسِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى؛عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى؛اِذْيَغْشَى السِّدْرَةَ مَايَغْشٰى؛مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰى؛لَقَدْرَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى'' [1]

استاد دراز کہتے ہیں: ''ان حروف میں گویا ایک شخص موسیقی بجا رہا ہے دوسرا دھن بجا رہا ہے تیسرا زمزمہ کر رہا ہے۔ چوتھا گا رہا ہے، پانچواں راگ الاپ رہا ہے اور چھٹا دم سادھے ہوئے ہے اور آپ کو ایک خوبصورت نغمہ محسوس ہوتا ہے''۔ [2]

بیرونی موسیقی قافیہ، سجع اور وزن جیسے مختلف فنون کا نتیجہ ہے لیکن قرآن میں ایک قسم کی باطنی موسیقی پائی جاتی ہے جو کہ صرف محسوس ہوتی ہے مگر اس طرزِ گفتار کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ جس میں لفظ کی خوبصورتی اور معنیٰ کی وسعت و بلندی سے انسان کے اندر ایک حیرت انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ایک روح افزا بادِ نسیم چلتی ہے جس سے انسان کے اندر ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے اور اس کی روح معراج کرنے لگتی ہے۔

جب ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں ''وَالضُّحٰى، وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى'' [3] یہ ایسی عبارت ہے جو قافیہ، وزن اور مصرع بندی کے جھنجھٹ سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ موسیقی سے سرشار ہے اور اس کے ہر حرف سے ایک جان فزا نغمہ پھوٹتا ہے۔ یہ نغمہ کہاں سے اور کیسے وجود میں آیا؟ یہ قرآن کی وہی باطنی موسیقی ہے جو قرآن کریم کے ترکیبی رازوں میں سے ایک راز ہے اور کوئی بھی ادبی شاہکار اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ [4]

د) وحدتِ موضوعی (آیات کے درمیان معنوی تناسب)

چونکہ قرآن کریم کی آیات مختلف مناسبتوں سے پراکندہ طور پر نازل ہوئی ہیں لہذا اس بات کا طبیعی تقاضا یہی ہے کہ ان آیات کے درمیان کسی قسم کا کوئی ربط یا معنوی تناسب نہیں ہونا چاہیے۔ عصر حاضر میں علماء ودانشور حضرات سورتوں کے مفاہیم کی جانچ پڑتال اور دقت وباریک بینی سے کام لیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر سورت کا خاص ہدف یا مقصد ہوتا ہے جس پر سورہ کی تمام آیات مشتمل ہوتی ہیں۔ اعجاز قرآن یہی ہے۔ سورتوں کے درمیان موجود اس وحدتِ سیاق کو ''موضوعی وحدت'' کہا جاتا ہے۔

بعض افراد آیات کے معنوی تناسب کے علاوہ سورتوں کے بھی معنوی تناسب پر کہتے ہیں:

''سورتوں کی ترتیب بھی معنوی تناسب پر انجام پائی ہے۔ بعض نے اس سے بڑھ کر اسے حکمت الٰہی جانا ہے اور سورتوں کی ترتیب کو بھی قرآن کا معجزہ ہونے پر بطورِ دلیل پیش کیا ہے''۔ [5]

---

[1] سورۂ نجم/آیت ۱۸۔۱

[2] النبأالعظیم؛ص۹۹۔۹۴

[3] سورۂ ضحیٰ/آیت ۲۔۱

[4] مزید معلومات کیلئے: علوم قرآنی؛ص۳۹۱۔۳۸۰

[5] تفسیر نوین؛ص۲۰۔۱۹

اہم نکتہ: سورتوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی معنوی تناسب نہیں پایا جاتا اور سورتوں کے درمیان موجودہ ترتیب توقیفی نہیں ہے بلکہ یہ ترتیب پیغمبر اکرمﷺ کی رحلت کے بعد صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں بعض اعتباری مناسبتوں (جیسے چھوٹی اور بڑی سورتوں وغیرہ) پر انجام پائی ہے۔

ھ۔ظریف نکات

قرآن مجید کی دیگر خصوصیات جو عربوں کے لئے حیرت کا موجب بنی ہیں وہ جدید نکات اور ادبی ظرافت کا دقت کے ساتھ استعمال ہے۔قرآن کریم میں مختلف قسم کے استعارے، تشبیہات، کنایہ، مجاز اور جدید نکات کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔اگرچہ تمام موارد میں عربوں کے رائج اسلوب کی رعایت کی گئی ہے لیکن استعمال کے مقامات اتنی دقت اور ظرافت سے انتخاب کیے گئے ہیں کہ عرب شاعروں، ادیبوں اور باریک بین افراد کے لئے حیرت کا باعث ہیں۔ادیبوں نے قرآنی تشبیہات کو پائیدار ترین تشبیہ قرار دیا ہے۔ایسی تشبیہ کلام عرب میں نہیں پائی جاتی، یہ تشبیہات بدیع نکات کی تمام خوبیوں کا جامع اور ترسیم معانی (الفاظ کے ذریعہ معانی کی نقشہ کشی اور ان کو ذہن نشین کرانا) کے فن میں حتی الامکان سلیس بیان پر مشتمل ہیں۔

جہان عرب کے مایہ ناز ادیب "ابن اثیر" نے تشبیہ کے متعلق قرآن کریم کی اس آیت "وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا"[1] کی مثال پیش کی ہے۔ان کے بقول: قرآن میں رات کے وقت کو لباس (جو بدن کو ڈھانپتا ہے) سے اس لیے تشبیہ دی گئی کیونکہ رات کی تاریکی افراد کو ایک دوسرے کی نگاہ سے چھپا کر رکھتی ہے تاکہ اگر کوئی دشمن سے فرار کرنا یا اس کے گھات میں بیٹھنا چاہے یا کسی چیز کو دوسروں سے چھپا کے رکھنا چاہے تو ان کاموں کے لئے وہ رات کی گہری تاریکی سے بہتر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ان تشبیہات میں ایسے ایسے ظریف نکات پائے جاتے ہیں کہ صرف قرآن کریم ہی ان سے آراستہ ہے اور ان کی مثال عربوں کے دیگر نثریہ اور نظمیہ کلام میں نہیں پائی جاتی ہے۔[2]

سوالات

۱۔اعجازِ قرآن کے مختلف پہلو بیان کریں؟

۲۔قرآن کریم کے کلمات کے انتخاب میں کن نکات کا خیال رکھا گیا ہے؟

۳۔قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کو دوسرے رائج اسلوبوں پر کیا فوقیت حاصل ہے؟

۴۔قرآن کریم میں وحدتِ موضوعی سے کیا مراد ہے؟ کیا سورتوں کے درمیان معنوی تناسب پایا جاتا ہے یا نہیں؟

---

۱) سورۂ نبا/آیت ۱۰

۲) المثل السائر: ج ۲، ص ۱۳۵۔۱۳۳ و ۱۲۸۔۱۲۶

اعجازِ قرآن کے مختلف پہلو (۲)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اعجاز قرآن کے درج ذیل تین پہلو ہیں:

۱۔ اعجاز بیانی ۲۔ اعجاز علمی ۳۔ اعجاز تشریعی

ان میں سے ایک پہلو (اعجاز بیانی) کی وضاحت پچھلے سبق میں کی جا چکی ہے۔ اب اس سبق میں اعجاز قرآن کے باقی دو پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

۲۔ اعجازِ علمی (سائنسی اعجاز)

علمی اعجاز سے مراد، ایسے سائنسی اشارے ہیں جو قرآن کریم کی بعض آیات سے نمایاں ہیں لیکن نزولِ قرآن کا اصلی ہدف انہیں بیان کرنا نہیں تھا۔ کیونکہ قرآن مجید کتاب ہدایت ہے اور اس کا اصلی مقصد انسان کی زندگی سنوارنا اور اسے سعادت کی راہ پر گامزن رکھنا ہے نہ کہ علمی (سائنسی) مسائل کا بیان۔ اس وجہ سے اگر قرآن کریم میں ہمیں بعض علمی و سائنسی اشارے ملتے بھی ہیں تو وہ اس جہت سے ہیں کہ یہ کلام الٰہی، علم و حکمت سے سرشار لامتناہی منبع کے ساتھ متصل ہے۔

''قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ؛ آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے باخبر ہے''۔[۱]

قرآن کریم میں علمی اشارے، بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض زمانۂ قدیم میں اور بعض ان آخری سالوں میں ترقی یافتہ جدید سائنسی وسائل کے ذریعہ واضح ہوئے ہیں اور شاید بہت سے دوسرے اشارے آئندہ رفتہ رفتہ آشکار ہوں۔ عصر حاضر کے دانشور حضرات نے اس موضوع پر تحقیق و جستجو کی بہت کوشش کی ہے۔ اگرچہ کچھ افراد نے خطا کی ہے لیکن بہت سے لوگ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ (علمی اشاروں کے نمونے کتاب ''التمھید'' کی چھٹی جلد اور کتاب '' قرآنی علوم'' میں '' اعجازِ علمی قرآن'' کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں)

---

[۱] سورۂ فرقان/آیت ۶

یہاں صرف دو نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

الف: زیادہ بلندی پر سانس کی تنگی

''وَ مَنْ یُرِدْ اَنْ یُضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ؛ خدا جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار گزار بنا دیتا ہے جیسے وہ آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو''۔[1]

اس آیت میں گمراہوں کی زندگی کو دشواری اور سختی سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کو ایسے افراد سے تشبیہ دی گئی ہے جو فضا کے بالائی طبقات کی طرف چڑھنے کی حالت میں ہو اور اس چڑھائی کے اثر سے وہ اپنے سینے پر سخت دباؤ اور سانس رکتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

قدیم مفسرین مذکورہ آیت کی وجہ تشبیہ پر اختلاف نظر رکھتے تھے۔ بعض معتقد تھے کہ اس تشبیہ میں مراد وہ شخص ہے جو پرندوں کے آسمان میں پرواز کی مانند اونچا اڑنے کی بیہودہ کوشش کرتا ہے۔ چونکہ یہ کام اس کی طاقت سے باہر ہے لہذا انہایت غمگین ہوجاتا ہے اور شدت غم سے اس کے لیے سانس لینا دشوار ہوجاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے: یہ تشبیہ ایسی حالت کیلئے ہے جب گھنے جنگلوں میں چھوٹے درخت رشد کرنا چاہیں تو بڑے درخت اپنی اونچائی کی وجہ سے انہیں آگے پھلنے پھولنے سے روکے ہوتے ہیں ایسے میں چھوٹے درخت بڑی مشکل سے آزاد فضا کی طرف رشد کر پاتے ہیں۔

اسی قسم کے مطالب بیان کیے گئے ہیں جن سے آیت کا مفہوم اچھی طرح واضح نہیں ہوتا۔

لیکن آج کل زمین کی سطح پر ہوا کے دباؤ اور بدن کے اندر خون کے دباؤ سے اس کے تناسب (جو اندرونی اور بیرونی دباؤ میں تعادل کا موجب ہے) کا علم ہونے کے ساتھ آیت میں وجہ تشبیہ واضح ہوجاتی ہے اور کچھ حد تک سابقہ تفسیری ابہامات بھی کم ہوجاتے ہیں۔

گذشتہ مفسرین کی یہ غلطی تھی کہ وہ اس عبارت ''یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ'' (عین اور صاد کی تشدید اور لفظ ''فی'' کے استعمال کے ساتھ) کا معنی آسمان کی طرف صعود کرنے کی کوشش سمجھتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر یہ معنی مراد ہوتا تو ''فِیْ'' کی بجائے ''اِلیٰ'' کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ دوسرا یہ کہ ''یَصَّعَّدُ'' لغت کے لحاظ سے ''صعود'' (اوپر چڑھنے کا) مفہوم ادا نہیں کرتا بلکہ باب تفعّل ''تصعّد'' میں اس لفظ کا استعمال سختی و دشواری میں پڑنے کا معنی دیتا ہے اور اس احساس کی شدت سے سینے میں سانس تک رک جاتا ہے۔ لہذا لغت میں ''تصعّد نفسه'' کے معنی مشکل سے سانس لینا، سینے کی تنگی اور درد و رنج محسوس کرنا ہیں۔ ''صعد'' اور ''صعود'' کے الفاظ کا اطلاق، ''صعب العبور'' وادیوں پر ہوتا ہے اور ہر سخت و دشوار امر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سورہ جن میں ارشاد رب العزت ہے:

''وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا؛ اور جو اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ موڑے گا اسے سخت عذاب کے

[1]) سورۂ انعام/آیت ۱۲۵

راستے پر چلنا پڑے گا''۔[۱]

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

''سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا؛

عنقریب اسے سخت ترین عذاب میں گرفتار کروں گا''۔[۲]

اسی وجہ سے ''كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ'' کے معنی یہ ہوں گے: وہ ایسے شخص کی مانند ہے جیسے کوئی فضا کی بلندی میں سانس کی تنگی، سختی اور انتہائی مشکل سے دوچار ہو''۔ درحقیقت جو شخص (زندگی) میں خدا کو بھول جائے وہ ایسے شخص کی مانند ہے جو فضائی بلندیوں میں ہو اور وہ سانس کی سختی اور درد و رنج میں مبتلا ہو۔ لہٰذا اس اعجاز انگیز عبارت سے یہ بات بخوبی سمجھ آتی ہے کہ اگر کوئی بغیر کسی حفاظتی وسیلے کے فضائی بلندیوں پر ہو تو اسی طرح کی دشواری اور سانس کی تنگی میں مبتلا ہوگا۔

اس زمانے میں ایسے سائنسی نکتے کی جانب اشارہ کرنا قرآن کریم کے علمی اعجاز کا ایک نمونہ ہے۔

ب: ہوائی پردوں کے ذریعہ زمین کی حفاظت

''وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ؛

اور ہم نے آسمان کو زمین کے گرد ایک محفوظ چھت قرار دیا ہے اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے برابر روگردانی کر رہے ہیں''۔[۳]

زمین کو بڑے ضخیم ہوائی پردوں نے گھیرا ہوا ہے جن کی بلندی ۳۵۰ کلومیٹر تک ہے۔ ہوا مختلف گیسوں ۷۸۰۰۳ فیصد ''نائٹروجن''، ۲۰۰۹۹ فیصد ''آکسیجن''، ۰٫۰۴ فیصد کاربن اکسائیڈ اور ۰٫۹۴ فیصد دوسری گیسوں اور بخارات سے مرکب ہے۔ ان ہوائی پردوں نے اپنی ضخامت اور گیسوں کے مذکورہ تناسب سے ایک مضبوط ڈھال کی طرح زمین کو گھیرے ہوئے ہے اس کی وجہ سے کرۂ زمین ہر طرف سے آنے والے متعدد ہولناک و خطرناک شہابوں کے نقصان سے محفوظ ہے اور زمین پر رہنے والوں کیلئے زندگی ممکن بنی ہوئی ہے۔

اطراف زمین کے پردوں میں اوزون (Ozone) کی تہہ کا وجود بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ گیس گرج چمک کے اثر سے وجود میں آتی ہے اور زمین کو نظام شمسی کی ضرر رساں کرنوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگر یہ پھیلے ہوئے نہ ہوتے تو زمین پر جینا مشکل ہو جاتا۔ قرآن کریم نے ایک ہزار چار سو سال پہلے ''سَقْفًا مَّحْفُوْظًا'' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایک علمی و سائنسی معجزہ ہے۔

---

[۱] سورۂ جن؍آیت ۱۷

[۲] سورۂ مدثر؍آیت ۱۷

[۳] سورۂ انبیاء؍آیت ۳۲

۳۔ اعجازِ تشریعی

انسان کے ذہن میں رازِ خلقت اور وسیع و عریض کائنات کے متعلق سوالات اُبھرتے ہیں اور اس کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اس بارے میں کوئی قابل اطمینان جواب حاصل کر سکے۔ اس قسم کے سوالات مثلاً: کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اور کہاں جائے گا؟ ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے کے لئے اس نے ہدف کائنات کے راز سے پردہ اٹھانے کی اپنی تمام کوششیں کیں لیکن اس کے باوجود انسان کو ایسا اطمینان بخش جواب نہیں ملا، جس سے ان سوالات کے تمام پہلو واضح ہو جائیں۔

اس بارے قرآن کریم فرماتا ہے:

''وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا؛ اور تمہیں تھوڑا سا علم دیا گیا ہے''۔[۱]

قرآن کریم نے دین کو جس طرح پیش کیا ہے اس میں ان تمام مسائل کے اطمینان بخش جواب موجود ہیں۔ قرآن کریم میں گہرے غور و فکر سے کج فکری درست ہو جاتی ہے اور ادھوری راہیں مکمل ہو جاتی ہیں:

''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ؛ اے لوگوں: تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا کا سامان اور ہدایت اور صاحبان ایمان کے لئے رحمت (قرآن) آچکا ہے''۔[۲]

دلوں کی شفا سے مراد، انسان کو رنج و مصیبت اور بے چینی سے نجات دینا ہے جو کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ الٰہی پیغامات رنج والم کا بہترین علاج ہیں۔ لہذا قرآن کریم نے انسان کو ایسی چیز عطا کی ہے جس کی تلاش میں وہ تھا لیکن صحیح طریقے سے اس تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ یہ خود اعجاز قرآن پر ایک دلیل ہے۔ اگر یہ لطف اور عنایت نہ ہوتی تو انسان اپنے مقصد تک ہرگز نہ پہنچ پاتا۔

اس زمانے کے بدوی قبائل سے لے کر مہذب ترین معاشروں تک، اس کائنات اور مبداء خلقت نیز تقدیر و تدبیر کے بارے میں جو نظریات رکھتے تھے، وہ حقیقت سے کہیں دور تھے اور تخیلات و تصورات تھے۔ انبیاء کے اقوال زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریف اور تبدیلی کا شکار ہو گئے تھے۔ لہذا اس زمانے کا انسان ہرگز یہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اور کہاں جائے گا؟ یہاں تک کہ قرآن مجید نے نئے سرے سے ان تمام مسائل کے قطعی اور واضح جوابات بیان کیے۔ دین اسلام کی خلاقیت دو طرح (۱۔ معارف ۲۔ احکام) سے ہے۔ قرآن کریم کے بیان کیے ہوئے معارف ہر طرح کی آلودگی اور خرافات سے دور ہیں اور احکام کے لحاظ سے جامع اور کامل ہونے کے علاوہ ہر طرح کے انحرافی رجحانات سے پاک و صاف ہیں۔

شریعت کے احکام اور قوانین جو زندگی کے اجتماعی نظام پر حاکم ہیں۔ ان میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انسانی قوانین میں نہیں ہیں۔

---

۱) سورۂ بنی اسرائیل/آیت ۸۵

۲) سورۂ یونس/آیت ۵۷

اول: شرعی قوانین ہر قسم کے انحرافی رجحانات سے مبرا و منزہ ہیں جو وضعی قوانین میں اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوم: اس جہاں میں انسان کی زندگی کے ان تینوں پہلوؤں کا ملاحظہ جو اس کی اجتماعی زندگی کا لازمہ ہیں۔ یعنی اپنے ذاتی اور فردی امور کے ساتھ اس کا تعلق، اس سماج کے ساتھ اس کا تعلق جس کے ہمراہ وہ رہ رہا ہے اور خداوند متعال کے ساتھ اس کا تعلق خصوصیت سے مدنظر رکھا گیا ہے۔

لیکن انسانی قوانین فقط فردی اور اجتماعی امور سے مربوط ہیں۔ بلکہ انسان کے انفرادی امور کی طرف کمتر توجہ دی گئی ہے اور اجتماعی امور کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ جبکہ پروردگار کے ساتھ رابطہ سے تو بالکل ہی غفلت برتی گئی ہے اور اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہی تیسری قسم ہے جو انسان کی زندگی کو روشنی بخشتی ہے اور انسان کو ''حیوانیت'' سے خارج کر کے اسے ملکوتی چہرہ عطا کرتی ہے۔

اب معارف اور شرعی احکام کے دو پہلوؤں میں قرآن مجید کے ہدایتی معجزے کو بطور خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

خدا متعال کی صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ

قرآن مجید نے خدا کی بہترین صفات بیان کی ہیں اور اسے کمال کی تمام صفات کا حامل قرار دیا ہے اور ہر قسم کی بری صفات سے پاک و منزہ جانا ہے۔ سورہ حشر کے آخر میں ہے:

''هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ؛ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ؛ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ؛ وہ ایسا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کو جانتا ہے اس کی عظیم اور دائمی رحمت تمام جہانوں پر محیط ہے اور یہ مہر و محبت خدا کے خاص صالح بندوں کو بھی شامل ہے وہ ایسا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں وہ فرمانروا ہے جو ہر قسم کی پستی اور کم ظرفی سے دور ہے اس کی رحمت کی کرنیں سب کو سلامتی اور سعادت سے ہمکنار رکھے ہوئے ہیں تمام جہانوں کے لئے آرام بخش ہیں سب اس کی محبت کے سائے میں آرام و سکون سے رہ رہے ہیں اس کی قدرت و شوکت اور وقار و عظمت وسیع تر ہے وہ زبردست اور کبریائی کا مالک ہے وہ تمام نام نہاد شریکوں سے پاک و پاکیزہ اور بے نیاز ہے وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا اور تمام موجودات کی صورتیں بنانے والا ہے اس کے لئے بہترین نام ہیں زمین و آسمان کا ہر ذرہ اسی کے لئے محو تسبیح ہے اور سب اس کی تعریف میں مگن ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو کچھ بھی کرتا ہے اپنی حکمت اور سمجھ بوجھ سے انجام دیتا ہے اسی طرح کوئی چیز بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس کے تمام ارادے اس کی حکیمانہ حکمت اور بینش سے انجام پاتے ہیں''۔[1]

---

[1] سورۂ حشر آیت ۲۴۔۲۲

یہ پروردگار کی بلند صفات کا ایک نمونہ ہے جس کے ساتھ قرآن پاک نے خدا کی توصیف بیان کی ہے لیکن کیا خدا کی اس طرح کی صفات دوسری کتب یا دیگر مکاتب فکر میں پائی جاتی ہیں یا اس کے برعکس لوگوں نے خدا کی ایسی صفات بیان کی ہیں جو اس کے مقام ربوبیت کے منافی ہے۔

موجودہ توریت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند متعال کی توصیف ایسے برے انداز میں کی گئی ہے کہ جس کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ بابل شہر کو بنانے کی داستان میں ہے کہ خدا کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ انسان جمع ہو کر ایک قدرت اور طاقت کی صورت اختیار کر لیں گے تو اس وقت خدا کو اپنی خدائی کے لیے بہت بڑے خطرے کا سامنا ہوگا۔لہذا جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ جا کر ان کو منتشر کر دے۔ [۱]

اس سے ہٹ کر قدیم یونان کے بناوٹی افسانوں میں خدا کا ایسا خاکہ پیش کیا ہے جس میں چھوٹے بڑے خداؤں (دیوتاؤں) کی اقسام کو بیان کیا گیا ہے۔ان میں سے بعض کا ذکر (جو صرف خرافات ہی ہیں) مشہور تاریخ دان ''ویلڈ یورنٹ'' نے اپنی کتاب ''تاریخ تمدن'' میں کیا ہے۔ [۲]

اسلامی احکام کی جامعیت

دین اسلام کو شرعی احکام کے لحاظ سے مکمل طور پر جامعیت حاصل ہے۔جبکہ باقی دوسری شریعتوں اور نیز انسانی وضعی قوانین میں اس طرح کی وسعت اور جامعیت دیکھنے میں نہیں آتی۔

اسلام ''عبادی، معاملاتی اور انتظامی'' تینوں امور میں اپنے مخصوص نظریات رکھتا ہے۔ان تینوں امور کے ہر پہلو پر اسلام نے اپنے وسیع اور گہرے نظریات پیش کیے ہیں اور بشریت کو سعادت مند مادی و معنوی زندگی تک پہنچنے کے لیے اپنی پیروی کی دعوت دی ہے۔

اسلامی عبادات انسانی روح کو تسکین بخشتی ہیں اور ملکوتِ اعلیٰ کے ساتھ انسان کے تعلقات کو مضبوط کرتی ہیں اور یہ چیز بذات خود انسانی روح کے لئے تقویت اور پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔نماز کے اذکار میں غور و فکر کرنے ،خلوص نیت اور دل کی گہرائیوں سے خدا کی ذات کی طرف توجہ کرنے ، نیز روزہ سے حاصل ہونے والی اندرونی طاقت میں غور کرنے ،مزید دعاؤں اور واجب و مستحب عبادات بالخصوص جب مقدس مقامات پر انجام دی جائیں ان سب میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں انسان کو باطنی پاکیزگی عطا کرنے اور کمال تک پہنچانے کے لیے ایک منظم پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔

''تزکیہ'' کا لفظ بتاتا ہے کہ عبادات کا ہدف ،وہی باطنی پاکیزگی ہے۔جیسا کہ سورہ والشمس میں ہے:

---

۱) سفر پیدائش؛ باب نمبر ۱۱،نمبر شمارہ ۲۴۔۲۲

۲) تاریخ تمدن؛ ج ۲،ص ۱۹۷ کے بعد

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا؛ وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا"۔[1]

انسان اپنے اندر یہ احساس کرتا ہے کہ اس وسیع وعریض جہان میں ایک ایسی قدرت وطاقت ہے جو تمام جہان پر محیط ہے اور انسان اپنے آپ کو ایسا چھوٹا سا ذرہ تصور کرتا ہے جو اس دنیا کے تلاطم خیز موجوں پر تیر رہا ہو۔

وہ ایک بہت بڑی طاقت اور قدرت ہے جس نے اس کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے دوسرے ذرات کو بھی محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اسی عجز وناتوانی کے احساس نے کمال مطلق اور طاقت مطلقہ کی طرف اس کی راہنمائی کی ہے۔ اس کی باطنی اور ذہنی توجہ کو کمال مطلق کی طرف راغب کیا ہوا ہے۔ اسی بنا پر وہ اندر سے یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کمال مطلق کی طرف اپنے لگاؤ اور عشق کا اظہار، الفاظ وکلمات (اُدعیہ واذکار) کی صورت میں کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دل کے اندر سے محبت اور شکر گزاری سے لبریز عبارتیں پھوٹ کر سیلاب کی طرح بہہ نکلتی ہیں اور اگر وہ اپنے اندر کوتاہی کا احساس کرتا ہے تو عفو ودرگذر کی درخواست کرتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ جس دن سے انسان نے اپنے آپ کو پہچانا ہے اسی دن سے اس سے مانوس ہے اس کے وجود میں پائی جانے والی فطرت ازل ہی سے اس کی ہمراز ہے۔

عبادات ومناجات انسان کے اندرونی جذبات واحساسات کی مجسم صورت ہیں جو مختلف انداز میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر دین و مذہب نے مخلصانہ انسانی عبادت کے بے ساختہ اظہار کے بعض گوشوں کو اپنے عملی مقاصد کا حصہ قرار دیا ہے۔

ہندوؤں اور زرتشتیوں (پارسیوں) کے پرانے دھرموں میں بھی اس قسم کی عبادت کی نمائش پائی جاتی تھی۔ نیز یہودی اور عیسائی مذاہب میں بھی عبادات کے طور طریقے رائج تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان مذاہب وادیان کی عبادتی صورتیں متعدد خرافات اور بدعتوں سے مل جل گئی ہیں۔

عبادات کے علاوہ معاملات کے مسائل اور ان کے ساتھ اسلام کے انتظامی اور اجرائی احکام اس قدر وسیع ہیں کہ محققین کے لئے حیرت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ اصولی طور پر دین اسلام جیسی کوئی بھی شریعت اس کائنات میں موجود نہیں ہے۔ جو اتنی وسیع ہو کہ جس میں حیاتِ انسانی کے تمام شعبے مدنظر ہوں اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھے ہو۔ پس کائنات کا واحد زندہ وجاوید دین اسلام ہے۔

"إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ؛ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔[2]

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ؛ اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور قیامت کے دن خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا"۔[3]

---

[1] سورۂ شمس/آیت ۹

[2] سورۂ آل عمران/آیت ۱۹

[3] سورۂ آل عمران/آیت ۸۵

سوالات

۱۔قرآن کریم میں علمی وسائنسی اشارات کیوں بیان کیے گئے ہیں؟

۲۔قرآن کریم کے اعجاز علمی وسائنسی کا کوئی ایک نمونہ بیان کریں؟

۳۔الٰہی قوانین میں انسانی زندگی کے کن پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے؟

۴۔قرآن کریم کا اعجاز تشریعی کس بارے میں ہے؟ آیت ''هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ'' (سورہ حشر: ۲۴۔۲۲) کس قسم کے اعجاز سے مربوط ہے؟

۵۔آیت ''قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا'' (سورہ شمس:۹) مدنظر رکھتے ہوئے اسلام اور دوسرے ادیان کے درمیان عبادات کا فرق بیان کریں؟

تحریف قرآن کی نفی

قرآن کریم میں تحریف کا شبہ قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اور علمائے اسلام اور محققین ہمیشہ اس کا انکار کرتے آئے ہیں۔ چونکہ مسئلہ تحریف قرآن کریم کے ظواہر کی حجیت کے ساتھ مربوط ہے لہذا یہ مسئلہ اہمیت کا حامل ہے۔ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی بنیاد سے تحقیق کی جائے تا کہ اس کا درست و نادرست ہونا معلوم ہو سکے۔

تحریف کے لغوی معنیٰ

تحریف کی اصل ''حرف'' ہے جس کے معنی کنارہ اور گوشہ ہیں۔تحریفِ کلام یعنی کلام کو اس کے طبیعی راستے سے ہٹانا۔الفاظ و عبارات کے طبیعی راستوں سے مراد ان کے حقیقی و واقعی معانی ہیں۔اُن معانی سے منہ موڑنے پر تحریف ہوگی۔

لہذا علماء تحریف کلام کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''کلام کے ظاہری معنی کے برخلاف اس کی تفسیر اور تشریح کرنا'' تحریف'' کہلاتا ہے''۔

اس طرح کی تفسیر ایک قسم کی نامناسب تأویل شمار ہوتی ہے یعنی کلام کا بدلنا اور اسے کسی دوسرے معنی کی طرف پلٹانا، ایسی تحریف کو'' معنوی تحریف'' کہتے ہیں۔ کیونکہ درحقیقت یہ لفظ کی دلالت اور معنی کو تبدیل کر کے اسے اپنے صحیح اور اصلی راستے سے منحرف کر دیتی ہے۔

تحریف کی اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں تحریف کے سات معانی بیان ہوئے ہیں:

۱۔ کلام کی دلالت میں تحریف

اس طرح نامناسب تفسیر و تأویل کرنا کہ جس سے لفظ کے لغوی معنی اس کی تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوں اور وضع لفظ یا کوئی قرینہ بھی اس پر دلالت نہ کرتا ہو، بلکہ صرف اپنی من پسند تفسیر اور تأویل کی گئی ہو۔ ایسی غیر مستند تأویل، ''تأویل باطل اور تفسیر بالرّائی'' شمار ہوتی ہے۔پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

''جس شخص نے بھی قرآن مجید کی اپنی من پسند تفسیر (تفسیر بالرأے) کی اس نے جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالیا''۔[۱]

۲۔قرآنی آیتوں یا سورتوں کو ترتیب نزول کے برخلاف مصحف میں قرار دینا

البتہ جمع قرآن کے موقع پر سورتوں کی ترتیب میں تو اس طرح کی تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن آیات میں اس طرح کی تبدیلی کا احتمال بہت ضعیف ہے۔

۳۔قرائتِ مشہور کے برخلاف قرائت

البتہ یہ اختلاف صدرِ اسلام سے صدیوں تک جاری رہا اور بعض قاری قرائتِ مشہور کے برخلاف قرأت کیا کرتے تھے۔

۴۔قریش کے لہجہ کے برخلاف قرائت

عرب قبیلوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص لہجہ تھا اور قریش کے لہجے کے برخلاف قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے، حالانکہ قرآن مجید قریش کے لہجہ میں نازل ہوا تھا۔البتہ پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اس اختلاف لہجہ کی اجازت فرمائی تھی۔حدیث ''نَزَلَ القُرآنَ عَلیٰ سَبعَۃِ أحرف ''لہجوں کے اس اختلاف کو بیان کر رہی ہے۔

۵۔الفاظ کی تبدیلی

یعنی کسی لفظ کو قرآن سے اٹھا کر اس کی جگہ اس کا مترادف لفظ رکھنا۔عبداللہ بن مسعود کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے کلمات کی تبدیلی کو اس شرط کے ساتھ جائز جانا کہ اصل معنی تبدیل نہ ہو۔لہذا وہ قرآن مجید کے سخت اور مشکل کلمات کو آسان الفاظ میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔

۶۔قرآن میں اضافہ

ابن مسعود کے متعلق ملتا ہے کہ وہ آیات کے درمیان بعض جملے تفسیر کے عنوان سے لے آتے تھے تاکہ آیت کا مفہوم بہتر طور پر واضح ہو جائے۔چنانچہ انہوں نے آیتِ تبلیغ میں ''ان علیاً مولی المؤمنین''، کے جملے کا اضافہ کر کے آیت کو اس طرح پڑھا ہے: ''یَآیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (ان علیاً مولی المؤمنین) وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ''[۲]

۱) غوالی اللئالی؛ ج ۴، ص ۱۰۴، شمارہ ۱۵۴

۲) سورۂ مائدہ/آیت ۶۷

نیز فرقہ بجاردہ (ابن عجرد کے پیروکار بعض خوارج) کا گمان ہے کہ قرآن مجید میں سورہ یوسف کو بڑھا دیا گیا ہے۔[1]

۷۔قرآن میں کمی

بعض کا گمان ہے کہ قرآن مجید موجودہ مقدار سے زیادہ تھا اور یہ کمی بھولے سے ہوئی ہے یا جان بوجھ کر کی گئی ہے۔تحریف کے مسئلہ میں بھی زیادہ تر اسی موضوع پر بحث وگفتگو ہوتی ہے اور یہ موضوع فریقین کے درمیان معرکۃ الآراء ہے کہ کیا قرآن مجید میں کوئی چیز کم ہوئی ہے یا نہیں؟ قرآن مجید میں کمی کا مسئلہ فریقین (سنی وشیعہ) کے منابع میں مذکور کچھ روایات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ البتہ اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں کبھی بھی کوئی چیز اضافہ نہیں ہوئی۔

نظریہ تحریف کی بنیاد

نظریہ تحریف کی بنیاد ایسی روایات ہیں جو فریقین کی حدیثی کتب میں درج ہیں کہ ظاہری طور پر وہ روایات کتاب کی تحریف پر دلالت کرتی ہیں۔اُن روایات کی یا تو سند ضعیف اور نامعتبر ہے یا ان کی دلالت نامکمل اور قابل تأویل ہے۔ان روایات کو اصولی اور کلامی کتب میں سرے سے رڈ کردیا گیا ہے۔

علامہ شیخ محمد جواد بلاغی اپنی تفسیر ''آلاء الرحمان'' کے مقدمے میں ایسی روایات کے متعلق لکھتے ہیں:''ان میں سے بعض روایات میں مفہوم کے اعتبار سے بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔اس کے علاوہ ان میں سے اکثر روایات کی سند ان افراد پر مشتمل ہے کہ جنہیں علماء نے ضعیف القول، فاسد العقیدہ اور روایات کے حق میں ظلم کرنے والا قرار دیا ہے۔ان میں سے بعض تو کذّاب (سراسر جھوٹے) معروف ہیں جن سے نقل روایت ہرگز جائز نہیں ہے۔حتی کہ ان میں سے ایک گروہ تو نہ صرف آئمہ علیہم السلام کی امامت کا منکر تھا بلکہ ان کے ساتھ دشمنی بھی کرتا تھا۔ان افراد کی روایت پر اعتماد نہ کرنے کیلئے خود یہ اوصاف ہی کافی ہیں''۔[2]

سنی وشیعہ نقل شدہ تمام روایات کی تحقیق کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایسی روایات جو شریعت پر طعن کا باعث ہیں ان میں سے اکثر جعلی اور دشمنوں کی من گھڑت ہیں یا یہ کہ کسی دوسرے معنی میں قابل تأویل ہیں اور ان کا تحریف کے مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔[3]

تحریف قرآن کے باطل ہونے کی اَدلہ

تحریف قرآن کی نفی پر دلائل بہت زیادہ اور مفصل ہیں۔یہاں پر مختصر طور پر ان کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] الملل والنحل؛ ج۱ص ۱۲۸

[2] تفسیر آلاء الرحمان؛ ج۱ص ۲۵

[3] مزید معلومات کے لیے؛ علوم قرآنی؛ ص ۳۶۰-۳۴۷

۱۔تاریخی شواہد

قرآن مجید شروع سے ہی سب (خصوصاً مسلمانوں) کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ خود محافظ قرآن تھے اور ہمیشہ اس کو حفظ کرنے، لکھنے اور محفوظ رکھنے کی تاکید فرماتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی یہ فریضہ تھا کہ وہ اس کو لکھیں اور حفظ کریں۔ اسی مقصد کے تحت وہ نسخے تیار کرتے اور اپنے گھروں میں صندوق یا کسی مخصوص جگہ پر کپڑوں میں لپیٹ کر محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ اسی زمانے سے حفظِ قرآن کا رواج پیدا ہوا اور ہمیشہ اسلامی معاشرے میں بہت سے افراد نے ''حفاظِ قرآن'' کے عنوان سے بڑی عزت اور مقام حاصل کیا۔

عام لوگوں کے علاوہ اس کتاب کی حفاظت کرنے میں بزرگان اور علماء اسلام کا کردار بھی قابل توجہ ہے۔ اس کتاب نے ہمیشہ مسلمانوں کے تقدیر ساز مختلف حالات میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور مختلف اسلامی علوم میں بھی یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلامی علوم کے کسی بھی موضوع پر مطالعہ کرنے والے دانشمند اور عالم کی ہدایت اور راہنمائی کرنے والا قرآن ہی تھا۔ بہت سے اسلامی علوم صرف قرآن کریم کے حقائق تک پہنچنے کیلئے وجود میں آئے ہیں۔ مسلمانوں کے بہت سے علوم کا منبع اور سرچشمہ قرآن ہے اسی بنا پر اسلامی علوم کے علماء ہمیشہ سے قرآن کریم کے محتاج رہے ہیں اور اگر اس میں کہیں بھی کوئی کمی یا بیشی ہوتی تو ضرور اس کا پتہ چل جاتا۔

۲۔قرآن کریم کا متواتر ہونا بدیہی ہے

شبہ تحریف کے باطل ہونے کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل قرآن کریم کے تواتر کا بدیہی ہونا بھی ہے۔ پورا قرآن قبول کرنے کی شرط اس کا متواتر ہونا ہے یہاں تک کہ قرآن کریم کو تمام حرکات وسکنات اور حروف والفاظ میں متواتر رہنا چاہیے یعنی تمام (جمہور مسلمین) نے ہاتھوں ہاتھ اور سینہ بہ سینہ نقل کیا ہے اسی وجہ سے تحریف قرآن کے بارے میں نقل ہونے والی وہ روایات جن میں آیا ہے کہ ''فلاں جملہ یا فلاں کلمہ قرآن سے تھا'' چونکہ یہ روایات خبر واحد (ایسی روایات جو تواتر تک نہ پہنچی ہوں) ہیں وہ قابل قبول نہیں ہیں اور ''تواتر قرآن کے لازمی ہونے'' کے قطعی قاعدے کی رو سے مسترد شمار ہوں گی۔ اس قاعدے (تواتر قرآن) کا شمار دینِ اسلام کی ضروریات میں سے ہوتا ہے اور علماء کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ بنیادی طور پر اصولی اور کلامی مسائل میں خبر واحد معتبر نہیں ہے بلکہ صرف فرعی مسائل میں معتبر ہے۔

۳۔اعجاز قرآن کا مسئلہ

ایک اور مسئلہ جو شبہ تحریف کی قطعی طور پر نفی کرتا ہے وہ اعجازِ قرآن ہے۔ علماء نے اعجاز قرآن کو شبہ تحریف کے بطلان پر سب سے اہم دلیل قرار دیا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اضافے کا لازمہ قرآن کی مثل لانا ہے۔ جبکہ بشر میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ وہ

قرآن کریم کی کسی ایک آیت کی ایسی مثل لا سکے، فصاحت و بلاغت اور بیان و مفہوم کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ربّ العزت ہے: ''قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا؛ آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو بھی نہیں لا سکتے چاہے وہ ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہی کیوں نہ ہو جائیں''۔ [1]

قرآن مجید میں کلمات کی تبدیلی کا احتمال بھی اسی طرح ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے کلمات اور منظم جملات میں ہر قسم کی تبدیلی اس بات کا باعث بنتی ہے کہ قرآن مجید کی تبدیلی سے حاصل ہونے والی صورت تبدیلی کرنے والے کی طرف منسوب ہو اور وحی کی صورت سے خارج ہو جائے۔

قرآن میں کمی بھی سبب بنتی ہے کہ کلام کے پہلے والے نظم اور اسکی ترتیب میں خرابی پیدا ہو جائے کہ جو قطعی طور پر کلام کی ادبی روش اور اسلوبِ کلام (جو فصاحت و بلاغت میں مؤثر ہے) میں تبدیلی کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا کمی کے بعد جدید نظم اور ترتیب کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی نظم الٰہی اور وحی الٰہی ہے۔ پس قرآن مجید کے کلمات میں کسی قسم کی کمی، بیشی یا تبدیلی کا گمان قرآن مجید کے نظم و ترتیب میں موجود اعجاز و معجزہ کے ساتھ تضاد رکھتا ہے۔

۴۔ الٰہی ضمانت

قرآن کریم کے تحریف سے سالم رہنے اور شبہ تحریف کے باطل ہونے پر واضح ترین دلیل قرآن کو ہمیشہ اپنی عنایات کے زیر سایہ قرار دیتے ہوئے اسے ہر قسم کی آفات و بلیّات سے محفوظ رکھنے کی ایسی خدائی ضمانت ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ؛ بیشک ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ [2]

یہ آیت قرآن کریم کے بالکل صحیح اور سالم ہونے کی ضمانت دے رہی ہے۔ ہاں قاعدۂ ''لطف'' کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم حقانیت اسلام کی زندہ سند اور نبوت کے صحیح ہونے کی پختہ اور محکم دلیل ہے۔ اس لیے ہمیشہ اسے آفات و بلیّات سے محفوظ رہنا چاہیے۔

۵۔ قرآن کریم، روایات کو پرکھنے کا معیار ہے

قرآن کریم کے تحریف سے محفوظ رہنے اور پوری تاریخ میں اس کی عدم تبدیلی کی دلیل وہ احادیث بھی ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل/آیت ۸۸

[2] سورۂ حجر/آیت ۹

سے نقل ہوئی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''حق تک پہنچانے کیلئے ہمیشہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جو حق کو آشکار کرتی ہے۔ ہر سچائی اور اچھائی کیلئے ایک نور ہے جو تمام حقیقتوں اور صحیح راستوں کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ پس (احادیث میں سے) جو بھی قرآن کے موافق ہوں انہیں لے لو اور جو قرآن کے مخالف ہوں انہیں چھوڑ دو''۔[۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے: اگر قرآن کریم کی تحریف اور اس کے نتیجے میں اس کے حجیت سے ساقط ہونے کا احتمال پایا جاتا تو کیا پھر بھی اس بات کی گنجائش تھی کہ قرآن کو روایات کے پرکھنے کا معیار قرار دیا جاتا جو روایات کے صحیح اور غلط ہونے کی واضح دلیل ہوتا؟ ہرگز ایسا نہیں! پس قرآن مجید کو ہمیشہ صحیح و سالم ہونا چاہیے تاکہ اس کی حجیت بھی برقرار رہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا معیار بھی ہو۔

۶۔ اہل بیت علیہم السلام کی نصوص

نفی تحریف کے بارے میں آئمہ معصومین علیہم السلام سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو قرآن کریم میں تحریف کی مکمل نفی کرتی ہیں۔[۲] شیعہ امامیہ بھی اہل بیت علیہم السلام کی پیروی میں اس بات کے معتقد ہیں کہ قرآن ہمیشہ سے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رہا ہے اور محفوظ رہے گا۔

ان روایات میں سے صرف ایک روایت بطور نمونہ بیان کی جاتی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے سعد الخیر کو ایک خط میں یوں تحریر فرمایا:

''قرآن کریم کو پشت کرنے کا ایک نمونہ یہ تھا کہ اس کے حروف اور کلمات کو تو اپنی جگہ ثابت رکھا گیا لیکن اس کے احکام و حدود میں تبدیلی و تحریف کی گئی ہے''۔[۳]

اس روایت میں معانی میں تبدیلی اور انحرافی تفاسیر کی بات ہے لیکن قرآن مجید کے الفاظ اور عبارتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اپنی جگہ برقرار ہیں۔

۷۔ اکابر شیعہ علماء کا نظریہ

اکابر شیعہ علماء قرآن مجید میں تحریف کے کبھی قائل نہیں تھے اور ان کی طرف نسبت دی جانے والی باتیں بالکل جھوٹی ہیں۔

---

۱) اصول کافی: ج۱،ص۶۹

۲) علوم قرآنی: ص ۴۵۴

۳) اصول کافی: ج۲،ص ۶۲۷، نمبر شمارہ ۱

البتہ ایسے شدت پسند اخباری حضرات جو کسی طور پر بھی مستند شیعہ علمائے میں شمار نہیں ہوتے انہوں نے اس بارے میں کچھ مطالب بیان کیے ہیں لیکن ان کی بات تمام شیعوں سے ہرگز منسوب نہیں کی جاسکتی۔

اب ہم اکابر علماء امامیہ میں سے رئیس المحدثین ابوجعفر شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ھ) کے نظریہ کو مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں جو اپنی کتاب ''رسالہ اعتقادات'' میں یوں لکھتے ہیں:

''ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن یہی موجودہ قرآن ہے جو بغیر کسی کمی بیشی کے ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں کے ساتھ لوگوں کے پاس موجود ہے۔ جو بھی ہماری طرف اس بات کی نسبت دے کہ اصل قرآن اس موجودہ قرآن سے زیادہ تھا تو وہ شخص جھوٹا ہے''۔[1]

مسئلہ تحریف کی منصفانہ تحقیق کرنے والے اہل سنت کے بہت سے علماء نے شیعہ امامیہ کو تحریف جیسی ناروا تہمت سے مبرّا جانا ہے۔ سب سے پہلے جس شخص نے شیعوں کے متعلق اس عیب سے پاک ہونے کی گواہی دی ہے وہ ''ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری'' متوفی ۳۲۴ھ، اشاعرہ کے پیشوا اور اشعری مکتب کے بانی ہیں عصر حاضر میں اہل سنت حضرات اسی مکتب کی پیروی کرتے ہیں وہ کہتے ہیں:

''شیعہ امامیہ کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تنگ نظر ہے، جو ظاہر بین اور کوتاہ فکر ہے اور وہ لوگ دینی مسائل میں گہری فکر نہیں رکھتے۔ یہ لوگ قرآن کریم کے بعض کلمات میں تحریف کے قائل ہیں ان کی دلیل وہ روایات ہیں جو محققین کے نزدیک معتبر نہیں۔ البتہ یہ لوگ قرآن کریم میں اضافہ کے بالکل منکر ہیں اور کہتے ہیں قرآن میں ہرگز اضافہ نہیں ہوا ہے۔ دوسرا گروہ محققین کا ہے، جو مجتہد اور صاحب نظر ہیں وہ قرآن کریم میں کمی اور بیشی دونوں صورتوں کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں: قرآن مجید جس طرح پیغمبر ﷺ پر نازل ہوا ہے اُسی طرح ابھی تک باقی ہے اور تحریف جیسی آفات سے بطور مطلق سالم رہا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی، بیشی اور تغییر و تبدیلی نہیں ہوئی ہے''۔[2]

اسی طرح اہل سنت کے بعض دوسرے اکابر علماء جیسے استاد شیخ محمد مدنی اور استاد محمد عبداللہ درّاز نے متعدد دلائل کی رُو سے شیعوں کا دفاع کیا ہے۔ انہیں اس تہمت سے مبرّا جانا ہے اور شیعوں کی طرف ایسی نسبت کو سراسر ظلم قرار دیا ہے۔[3]

---

[1] اعتقادات شیخ صدوق ہمراہ شرح باب حادی عشر؛ ص ۹۴ ـ ۹۳

[2] مقالات الاسلامیین؛ ج ۱ ص ۱۲۰ ـ ۱۱۹

[3] صیانۃ القرآن من التحریف؛ ص ۸۱ ـ ۷۹

سوالات

۱۔شبہہ تحریف میں کون سے معانی بیان ہوئے ہیں اور زیادہ بحث کس معنی کے بارے میں ہے؟

۲۔عدم تحریف قرآن کے دلائل مختصر طور پر بیان کریں؟

۳۔تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی روایات کا جواب کیسے دیا جا سکتا ہے؟

۴۔''تواتر قرآن کا لازمی ہونا'' شبہہ تحریف کو کیسے برطرف کرتا ہے؟

۵۔تحریف قرآن، سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۸ ''قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ'' سے میل نہیں رکھتی، وضاحت کریں؟

۶۔شبہہ تحریف پر شیعہ نظریے کے متعلق شیخ صدوق ؒ کا بیان تحریر کریں۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ علوم قرآن کے تمام موضوعات کو نہایت سادہ اور سلیس پیش کیا جائے اور ہر درس کے آخر میں موجود سوالات میں موجود تمام مطالب ذکر ہوں، تاکہ اگر کوئی ان سوالات کے جوابات کو سمجھ لے تو اُسے اطمینان حاصل ہو کہ اُس نے علوم قرآن کا ایک مختصر لیکن جامع مطالعہ کر لیا ہے۔ یہ کتاب دینی مدارس، قرآنی مراکز اور یونیورسٹیوں میں تدریس کیلئے تالیف کی گئی ہے۔

+92 322 4148057
+92 423 5969264
AltanzilFoundation
www.altanzil.com
idaratanzeel@gmail.com